معارف

نومبر ۲۰۱۵ء

مجلس دارالمصنّفین کا ماہوار علمی رسالہ

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ

سالانہ زرتعاون

ہندوستان میں سالانہ ۲۸۰/روپئے۔ فی شمارہ ۲۵/روپئے۔ رجسٹرڈ ڈاک ۴۸۴/روپئے
دیگر ممالک میں سادہ ڈاک ۱۶۶۰/روپئے۔ دیگر ممالک رجسٹرڈ ڈاک ۱۷۸۰/روپئے
ہندوستان میں ۵ سال کی خریداری صرف ۱۳۰۰/روپئے میں دستیاب۔

(اوپر کی رقوم ہندوستانی روپئے میں دی گئی ہیں)

پاکستان میں ماہنامہ معارف کے لئے رابطہ کریں

سجاد الٰہی صاحب، 27-A لوہا مارکیٹ، مال گودام روڈ، بادامی باغ، لاہور (پاکستان)

Tel: 0300 - 4682752, (R) 5863609, (O) 7280916

Email: abdulhadi_133@yahoo.com

سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔ بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں۔

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY, AZAMGARH

- زرتعاون ختم ہونے پر تین ماہ کے بعد رسالہ بند کردیا جائے گا۔
- معارف کا زرتعاون وقت مقررہ پر روانہ فرمائیں۔
- خط وکتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافے پر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔
- معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔
- کمیشن ۲۵ فیصد ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہئے۔

مقالہ نگار حضرات سے التماس

- مقالہ صفحہ کے ایک طرف لکھا جائے۔
- حواشی مقالے کے آخر میں دیئے جائیں۔
- مآخذ کے حوالہ جات مکمل اور اس ترتیب سے ہوں: مصنف یا مؤلف کا نام، کتاب کا نام، مقام اشاعت، سن اشاعت، جلد یا جز اور صفحہ نمبر۔

عبدالمنان ہلالی (جوائنٹ سکریٹری/منیجر) نے معارف پریس میں چھپوا کر
دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ سے شائع کیا۔

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی کا علمی و دینی ماہنامہ

معارف

جلد نمبر ۱۹۶ ماہ صفر المظفر ۱۴۳۷ھ مطابق ماہ نومبر ۲۰۱۵ء عدد ۵

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی
پوسٹ بکس نمبر: ۱۹
شبلی روڈ، اعظم گڑھ (یوپی)
پن کوڈ: ۲۷۶۰۰۱

فہرست مضامین

شذرات

ملک کے موجودہ حالات ہر باشعور اور حسّاس شہری کے لیے گہری تشویش کے باعث ہیں۔ موجودہ حکومت کے اقتدار میں آنے کے بعد ہی سے فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور قومی یکجہتی شدید دباؤ میں ہے۔ حکمراں طبقہ کی طرف سے جس طرح کا طرز عمل اختیار کیا جارہا ہے اور اس کے نتیجہ میں ایک تسلسل سے جس طرح کے واقعات ظہور پذیر ہورہے ہیں اسے عدم رواداری اور عدم تحمل جیسے الفاظ سے تعبیر کرنے سے صورت حال کی صحیح عکاسی نہیں ہوتی۔ بات اب اس سے بہت آگے جاچکی ہے۔ جب صدر جمہوریہ بار بار اس سلسلہ میں اپنی فکرمندی کے اظہار پر مجبور ہوجائیں تو سمجھ لینا چاہیے کہ سب کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ نریندر ڈھابولکر، گووند پانسرے، پروفیسر کل برگی اور محمد اخلاق سے دلت بچوں کے زندہ جلا دیے جانے تک جارحیت اور تشدد کا ایک سلسلہ ہے جو دراز ہوتا چلا جارہا ہے اور اس کے تاریک سایے ملک کے طول وعرض میں پھیلتے چلے جارہے ہیں۔ اس کے نتیجہ میں ایک ایسی فضا بن رہی ہے جس میں اقلیتیں اور کمزور طبقات اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھنے لگے ہیں۔ ایک ایسا ماحول بنانے کی کوشش ہورہی ہے جس میں ایک مخصوص نقطہ نظر کو مکمل بالادستی حاصل ہوجائے اور آزادی خیال، آزادی اظہار اور اختلاف رائے کی گنجائش ہی باقی نہ رہے۔ اس وسیع وعریض ملک میں رہنے بسنے والے تمام لوگ اسی انداز پر سوچیں جس طرح وہ چاہتے ہیں، زندگی اسی طرح گذاریں جس طرح وہ پسند کرتے ہیں، لباس وہی پہنیں جس کی وہ اجازت دیں اور کھانا وہی کھائیں جو وہ تجویز کریں۔ غرض کہ پورے ملک کو وہ اپنے من پسند رنگ میں رنگ دینا چاہتے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ فسطائی طاقتیں بہت عجلت میں ہیں۔ ان کو اندیشہ ہے کہ یہ موقع شاید دوبارہ ہاتھ نہ آئے۔ یوں تو یہ لوگ بڑے سیانے ہیں لیکن ان کو اس ملک کی تاریخ اور تہذیبی اقدار کا ادراک نہیں جس میں اس طرح کے طرز عمل کی گنجائش نہیں۔

عام طور پر دانش وروں کا دائرہ کار فکری اور نظری سطح تک محدود ہوتا ہے۔ عملی دنیا سے ان کا سروکار کم ہی ہوتا ہے۔ بڑے دانشور اور فنکار اکثر اپنے افکار اور تخیلات کی دنیا میں گم رہتے ہیں اور کئی بار ان کو اپنے گردوپیش کی بھی کچھ زیادہ خبر نہیں ہوتی۔ ان کا مقام ومنصب معاشرہ کے اجتماعی ضمیر کی پاسبانی ہے لیکن ان میں ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں ہوتی جو اپنے قلم کی حرمت کی حفاظت سے قاصر رہتے ہیں اور

اقتدار وقت کے ہاتھوں اپنے قلم اور اپنے ضمیر کو گروی رکھنے میں بھی عار محسوس نہیں کرتے۔ وطن عزیز میں بھی ایسے دانشوروں اور فنکاروں کی کمی نہیں۔ لیکن یہ بات باعث طمانیت ہے کہ ملک کی تاریخ کے اس نہایت نازک موڑ پر اہل قلم، ادیب، شاعر، مصنف، مورخ، سائنس داں، فنکار اور فلم ساز ملک اور معاشرہ کے تئیں اپنی ذمہ داریوں کا پورا ادراک رکھتے ہیں۔ ان کی ایک معتد بہ تعداد نے نہ صرف صورت حال کی نزاکت کو محسوس کیا بلکہ حکمرانوں کی طرف سے شدید مزاحمت کے باوجود پوری جرأت اور حوصلہ سے اصلاح احوال کے لیے آگے بڑھے۔ نفرت، عداوت، فرقہ پرستی، عدم تحمل اور عدم رواداری کے اس گھرے اندھیرے میں ان کی حیثیت شمع فروزاں کی ہے۔ مشہور دانشور اور جدید ہندوستان کے معمار پنڈت جواہر لال نہرو کی بھانجی محترمہ نین تارا سہگل کی جرأت رندانہ نے جس وادی پر خار میں قدم رکھا سود وزیاں کی مصلحتوں سے بے نیاز آج دانشوروں کا ایک کارواں اس پر رواں دواں ہے اور اس میں برابر اضافہ ہوتا چلا جارہا ہے اور چراغ سے چراغ جلتے چلے جارہے ہیں۔

آغشتہ ایم ہر سرِ خارے بخون دل قانونِ باغبانی صحرا نوشتہ ایم

ملکی اور قومی سطح پر کسی دانشور اور فنکار کو آسانی سے اعتراف نہیں ملتا۔ اس منزل تک پہنچنے کے لیے اسے برسوں ریاض کرنا پڑتا ہے اور اپنے فن کی خون جگر سے آبیاری کرنی پڑتی ہے۔ جانب داری اور اثرات کی اس دنیا میں نہ جانے کتنے اور بھی ہفت خواں ہوتے ہیں جن کو سر کیے بغیر اعتراف فن کا تصور بھی مشکل ہے۔ اتنے ریاض کے بعد حاصل ہونے والا اعتراف اور امتیاز فنکار کے لیے ایک قابل فخر اثاثہ ہوتا ہے اور اس کو لوٹانے کا تصور بھی آسان نہیں۔ قابل ستائش اور قابل مبارک باد ہیں یہ دانشور اور فنکار کہ انہوں نے جب محسوس کیا کہ ملک کے افق پر منڈلاتے ہوئے اس خطرہ کا مقابلہ کرنے کے لیے ان کے پاس یہی ہتھیار ہے تو انہوں نے اس متاع عزیز کو قربان کرنے کا فیصلہ کرلیا اور کوئی مصلحت اندیشی ان کی راہ میں حاصل نہ ہوسکی۔ دانشوروں اور فنکاروں کی ایک بڑی تعداد اپنے خطابات، انعامات اور ایوارڈ لوٹا چکی ہے اور یہ سلسلہ ابھی جاری ہے۔ یہ ایک عدیم النظیر واقعہ ہے جس کی ملک کی تاریخ میں کوئی مثال نہیں۔ پورا ملک ان کا ممنون احسان ہے۔ حکومت وقت اگرچہ اس طاقتور اور موثر احتجاج کو نظر انداز کرنے کی پوری کوشش کررہی ہے لیکن اس امر میں شبہہ کی گنجائش نہیں کہ وسیع تر ہندوستانی معاشرہ پر اس کے دوررس اثرات مرتب ہوں گے اور ان کی اس جد و جہد کو ہمیشہ تشکر و امتنان کے ساتھ یاد رکھا

جائے گا۔ حالات اچھے نہیں ہیں لیکن اطمینان کی بات یہ ہے کہ ملک کا اجتماعی ضمیر زندہ ہے اور اس کی آبادی کی غالب اکثریت باہمی اتحاد و یگانگت اور رواداری پر پختہ یقین رکھتی ہے۔ اگر کسی کو اس میں شبہہ تھا تو بہار کے انتخابی نتائج نے اس کا بھرپور ازالہ کر دیا ہے۔

اسی سال جون کے انتخابات میں آق پارٹی (A.K.P) پارلیمنٹ میں اکثریت حاصل کرنے میں ناکام رہی تھی۔ مخلوط حکومت کی تشکیل بھی ممکن نہیں ہوئی۔ اس وجہ سے چند مہینوں بعد ہی دوبارہ الیکشن ناگزیر ہو گیا۔ اس دوران ملک اور خطہ کے حالات میں مزید ابتری آئی۔ ملک دہشت گردانہ حملوں کی زد میں رہا۔ کرد انتہا پسندوں نے بھی حکومت کے خلاف کارروائیوں کو تیز کر دیا۔ پڑوس میں شام کے حالات مزید بگڑ گئے۔ ان منفی عوامل کے پیش نظر آق پارٹی کی پالیسیوں سے اختلاف رکھنے والے یہ امید کر رہے تھے کہ اس بار پارٹی کو پہلے سے بھی زیادہ سخت ہزیمت اٹھانی پڑے گی۔ لیکن جب نتائج آئے تو وہ ان اندازوں اور امیدوں کے یکسر خلاف تھے۔ یکم نومبر کو ہونے والے انتخابات میں آق پارٹی نے شاندار کامیابی حاصل کی اور ۵۵۰ نشستوں کی پارلیمان میں وہ ۳۱۷ نشستوں پر کامیاب رہی۔ خاص بات یہ ہے کہ یہ کامیابی ملک کے کسی خاص خطہ یا علاقہ تک محدود نہیں تھی بلکہ تمام خطوں اور علاقوں پر محیط تھی، یہاں تک کہ کرد علاقوں میں بھی شدید شورش کے باوجود اسے قابل لحاظ حد تک ووٹ ملے اور اس کا نقصان کرد نواز پارٹی HDP کو اٹھانا پڑا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آق پارٹی ترک عوام کو یہ یقین دلانے میں کامیاب رہی کہ جون کے الیکشن سے اس نے ضروری سبق حاصل کر لیے ہیں۔ نیز ان کمیوں اور کوتاہیوں کے باوجود جو غلط یا صحیح صدر اور پارٹی کے سلسلہ میں سمجھی اور محسوس کی جا رہی تھیں ان کی تیرہ سالہ خدمات کا ریکارڈ بھی سب کے سامنے تھا جو ہر لحاظ سے ایک غیر معمولی ریکارڈ ہے۔ اس عرصہ میں ترکی کی پوری تصویر جس طرح بدل گئی اس سے بھی سب واقف تھے۔ ان کے اقتدار میں آنے سے پہلے ملک کی جو حالت تھی وہ بھی سب پر عیاں تھی۔ چنانچہ ترک عوام نے ان پر دوبارہ اعتماد کیا، استحکام اور تسلسل کو ترجیح دی اور کوئی نیا تجربہ کرنے کے بجائے آزمودہ لوگوں پر بھروسہ کیا۔ امید کی جانی چاہیے کہ حکومت ترک عوام کے اعتماد پر پوری اترے گی اور اس کے زیر قیادت ترکی تحفظ، استحکام اور ترقی کی نئی رفعتوں تک رسائی حاصل کرے گا اور اس کے مثبت اثرات نہ صرف خطے میں بلکہ عالمی سطح پر محسوس کیے جائیں گے۔

مقالات

تہذیب قوم نوحؑ

جناب محمد طارق غازی

سفینۂ نوحؑ کے متعلق رائج تصورات سے انسان کے بالکل ابتدائی زمانہ کی ایک غیر ترقی یافتہ دیہاتی سی قوم کا تصور مرتب ہوتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ سفینہ کو مناسب توجہ نہ مل سکی۔ قرآن حکیم نے قوم نوحؑ کی سرکشی کے عنوان سے بات کر کے باقی معاملات کو اہل تحقیق کے لیے اس سوال کے ساتھ چھوڑا ہے کہ جس قوم کے ایک ایک سرکش فرد کی ہڈیاں بھی پانی میں گھل گئیں اور جس کی ترقی، تہذیب اور تمدن کے آثار تک باقی نہ رہنے دیے گئے وہ کیسی باغی و طاغی ہوگی اور اس درجہ کی بغاوت و سرکشی کے مادی اسباب کیا ہو سکتے تھے۔ ان سوالوں کا جواب سفینۂ نوحؑ کے مطالعہ میں ملتا ہے۔ اسی سفینہ میں ایک عظیم الشان تہذیب کی حیران کن تفصیلات کو بھی پناہ ملی تھی۔

فَاَوْحَیْنَآ اِلَیْہِ اَنِ اصْنَعِ الْفُلْکَ بِاَعْیُنِنَا وَ وَحْیِنَا (المومنون ۲۳:۲۷)

ہم نے ان کے پاس حکم بھیجا کہ تم سفینہ تیار کر لو ہماری نگرانی میں اور ہمارے حکم سے

حضرت نوحؑ کو حضرت آدمؑ کے علم الاسماء اور نبوت و رسالت کی میراث اپنے والد کے دادا حضرت ادریسؑ کے واسطہ سے ملی تھی۔ اگرچہ نبوت پشتینی میراث نہیں ہوتی اور نبی و رسول کا انتخاب صرف اللہ تعالیٰ کا حق ہے کہ وہ چاہے تو باپ کے بعد بیٹے کو بھی نبوت سے سرفراز کر دے جیسا کہ حضرت آدمؑ اور حضرت شیثؑ، حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ و حضرت اسحاقؑ و حضرت یوسفؑ اور حضرت داؤدؑ و حضرت سلیمانؑ کی مثالیں ہیں، لیکن یہاں میراث سے مطلب یہ ہے کہ حضرت نوحؑ کی پیدائش کے وقت ہی ان کے دادا متوشلح کے ایک مکاشفہ میں حضرت ادریسؑ نے ان کی بزرگی اور برگزیدگی کا اعلان کر دیا تھا۔

ڈائریکٹر امم اسٹڈیز ہاؤس (USH) ٹورانٹو، کینیڈا۔

امام ابوحیان اندلسی (بحر المحیط ۸: ۳۳۲) نے شیخ المرسلین اور آدم ثانی کے خطابات کے ساتھ ان کا نسب یوں دیا ہے: نوح ابن لامک (دوسری روایت میں لمک) ابن متوشلح بن اخنوخ جو ادریس ہیں ابن یرد (یارد/ الیارد) ابن مہلا ئیل بن انوش بن قینان بن شیث بن آدم علیہم السلام۔ یہاں ایک تسامح ہوا ہے۔ عام طور پر مشہور ہے کہ حضرت شیث کے بیٹے انوش تھے اور ان کے پوتے کا نام قینان تھا۔ مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی (قصص القرآن ۱: ۶۳) نے مہلا ئیل بن قینان بن انوش بن شیث لکھا ہے۔ اس حوالہ سے ناموں کی یہی ترتیب مولانا محمد جمال بلندشہری (جمالین فی شرح جلالین ۶: ۴۸۴) نے بھی نقل کی ہے۔ امام آلوسی (روح المعانی ۲۹: ۶۸) نے بھی قینان بن انوش بن شیث کی ترتیب سے یہی شجرہ دیا ہے۔

حضرت نوحؑ دنیا کی پہلی متمدن تہذیب کے اختتامی دور کی اہم ترین شخصیت تھے۔ حضرت ادریسؑ کے عہد میں تہذیب انسانی ایجادات واختراعات کی رفعت کمال کو پہنچ گئی تھی۔ ان دونوں بزرگوں کے عنوان سے اسے دو تہذیبوں کا نام بھی دیا جاسکتا ہے اور ایک ہی تہذیب کا تسلسل بھی کہا جاسکتا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ قوم ادریس پر عذاب نازل نہیں ہوا تھا اور قوم نوح دراصل اسی قوم کا تمدنی اور تہذیبی اور نسلی تسلسل تھی۔ البتہ عہد نوح میں تہذیب اتنے بلند مقام پر پہنچ گئی تھی کہ اس کا مستقل ذکر ضروری ہے۔ توقیتی سہولت کی خاطر بھی اسے دو قوموں کی تہذیب کہنا مناسب ہے۔

تاریخ نوحؑ کے تین ماخذ: ان دو بالکل ابتدائی قوموں کے حالات جاننے کے لیے ہمارے پاس دو ہی ذرائع ہیں: ایک تو یہودی اور مسیحی بائبلیں اور دوسرے قرآن حکیم اور اس کی کچھ تفسیری احادیث۔ حبشی توحیدی کلیسا کی بائبل کا مصحفہ اخنوخ اضافی ذرائع میں آتا ہے۔ مصحفہ اخنوخ کے آخری تین ابواب ۱۰۶، ۱۰۷، ۱۰۸، حضرت نوحؑ کے متعلق ہیں اور ان تین میں سے پہلے دو کے بارے میں حبشی توحیدی کلیسا کا دعویٰ ہے کہ وہ صحف نوحؑ کی باقیات ہیں۔ اسی مصحفہ میں آتا ہے کہ جب لمک بن متوشلح بن اخنوخ کے ہاں حضرت نوحؑ کی ولادت ہوئی تو بیٹے کو دیکھ کر وہ بڑے پریشان ہوئے۔ ''بچہ کی جلد برف (دودھ) سے زیادہ سفید اور گلاب کے پھول سے زیادہ سرخ تھی، سر کے بال اون کی طرح گھنگھریالے سفید تھے، آنکھیں خوبصورت اور سورج کی

مانند روشن تھیں، ان کے وجود سے سارا گھر منور ہو گیا تھا۔ پھر دائی کے ہاتھوں میں وہ اٹھ بیٹھے، اپنا منہ کھولا اور اللہ کی حمد بیان کی''۔ لمک پریشان ہو کر اپنے والد متوشلح کے پاس گئے اور انہیں خبر کی کہ ان کے گھر میں ایک عجیب و غریب بچہ کی ولادت ہوئی ہے۔ انسان نہیں فرشتہ پیدا ہوا ہے، وہ کوئی آسمانی مخلوق ہے۔ اس کی آنکھوں سے سورج کی سی کرنیں پھوٹتی ہیں اور اس کا چہرہ مقدس ہے۔ لمک نے اپنے والد متوشلح سے کہا کہ وہ اپنے والد اخنوخ سے مشورہ کریں کیونکہ اس بچہ کا گھر تو فرشتوں میں ہوگا۔ یہ سن کر متوشلح دنیا کے آخری کنارہ پر اخنوخ کے پاس گئے۔

چونکہ اس وقت حضرت ادریسؑ دنیا میں تشریف نہیں رکھتے تھے اس لیے اس بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ متوشلح کا کشف تھا۔ بہرحال متوشلح نے سارا ماجرا اپنے والد بزرگوار کو سنایا کہ انسانوں میں تو ایسا بچہ کبھی پیدا نہیں ہوا تھا۔ اخنوخ نے کہا، فکر نہ کرو، اللہ دنیا میں ایک بڑا کام کرنے والا ہے جیسا کہ میں اپنے رویا میں دیکھ چکا ہوں اور تمہیں خبردار کر چکا ہوں۔ دنیا میں گناہوں کی کثرت ہوگی، ایک طاقتور قوم زمین پر فساد برپا کرے گی اور نجاست پھیلا دے گی۔ اس نجاست کی صفائی ضروری ہوگی۔ ہاں ساری دنیا میں ایک سال تک بڑا طوفان آئے گا اور روئے زمین پر کوئی (کافر) باقی نہیں رہے گا سوائے تمہارے بیٹے اور اس کے تین بیٹوں کے، باقی سارے انسان مٹا دیے جائیں گے۔ جاؤ، اپنے بیٹے لمک کو بتا دو کہ وہ انہی کا بیٹا ہے اور اس کا نام نوح رکھو۔ (مصحفہ اخنوخ۔ باقیات صحیفہ نوح ۱۰۶:۱۔۱۸)

مصحفہ اخنوخ کی ثقاہت کے بارہ میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ حبشی توحیدی کلیسا کی بائبل میں شامل ہے اگرچہ باقی تمام چھوٹے بڑے عیسائی فرقے اور یہودی اس کے منکر ہیں۔ اس میں حضرت نوحؑ کی معجزاتی ولادت کا بیان قابل توجہ ہے اور اس میں نکارت یا کفر و شرک کا کوئی پہلو بھی نہیں ہے۔

پہلی تہذیب اور پہلی تخریب: اولاد آدم میں حضرت نوحؑ دوسرے رسول ہیں۔ مفسرین عام طور سے انہیں پہلا رسول قرار دیتے ہیں، شاید اس لیے بھی کہ قرآن حکیم میں ان کے والد کے دادا حضرت ادریسؑ کا ذکر بہت ہی مختصر آیا ہے اور ان کے سلسلہ کی دو آیات کی شرح بھی تفصیلی نہیں ہے۔ بایں ہمہ، حضرت نوحؑ کا شمار اولوالعزم اور صاحب شریعت انبیاء میں ہے۔ جلالی انبیاء میں وہ

پہلے ہیں کیونکہ صدیوں تک قوم کی اصلاح احوال کی انتھک کوششوں کے بعد بالآخر بحکم الہٰی انہوں نے بد بخت قوم کے لیے بددعا کی اوراس کی تاثیر سے زمین پر سے کفر وشرک، تمرد وسرکشی، طغیان و بغاوت ہی نہیں ایک زبردست عالمی تہذیب کا مکمل خاتمہ اپنے تمام آثار کے ساتھ ہوگیا۔ انسان کی بنائی ہوئی وہ پہلی تہذیب تھی جو اپنے گناہوں کے طوفانی سمندر میں غرق ہوئی تھی۔ البتہ علم کی میراث حضرت نوحؑ کی اولاد اور قوم کے دیگر مومنین کے پاس باقی رہی۔

قرآن حکیم کی رو سے ۹۵۰ برس تک (العنکبوت ۲۹: ۱۴) وہ دن رات، علانیہ اور نجی ملاقاتوں اور سرگوشیوں میں (نوح ۷۱: ۵-۸) اپنی قوم کی اصلاح کی کوشش کرتے رہے مگر متکبر قوم نسل بعد نسل کفر وشرک پر مصر رہی اور بالآخر اس نے خود ہی عذاب کو دعوت دی (ہود ۱۱: ۳۲) اور صفحۂ ہستی سے حرف غلط کی طرح مٹا دی گئی۔ بائبل میں ہے کہ طوفان کے وقت حضرت نوحؑ کی عمر ۶۰۰ سال تھی (تکوین ۷: ۶) یعنی حضرت نوح نے کچھ کم ۶۰۰ سال تک قوم کی اصلاح کی کوشش کی تھی۔ لیکن قرآن حکیم کے بیان کے سامنے اس بیان کو قبول نہیں کیا جاسکتا۔ بائبل کے کچھ بیانات باہم متخالف ہیں کہ ان کی عقلی توجیہ مشکل ہے، ایک طرف آتا ہے ''خدا نے انسان اپنی صورت پر پیدا کیا'' (اردو بائبل تیرا کلام پیدائش ۱: ۲۷) اور دوسری طرف کہا گیا کہ ''خداوند زمین پر انسان کو پیدا کرنے سے ملول ہوا اور دل میں غم کیا'' (پیدائش ۶: ۶)، گویا انسان کی تخلیق ہی درست نہ تھی، مگر پھر انہی انسانوں میں سے حضرت نوحؑ اور ان کے خاندان کو بچا لیا گیا، حالانکہ بعد میں خود ان کی اولاد میں نمرود وفرعون جیسے ظالم وجابر لوگ بھی پیدا ہوئے۔

نجات پانے والوں کی تعداد: مفسرین کہتے ہیں کہ تقریباً ہزار سال کی طویل مدت میں حضرت نوحؑ پر ۸۰ سے زیادہ لوگ ایمان نہیں لائے تھے اور وہ بھی معاشرہ کے کمزور اور پست طبقہ کے لوگ تھے۔ سفینہ میں نجات پانے والوں کی تعداد کے متعلق بڑے متعارض بیانات ہیں۔ امام ابوحیان اندلسی (بحر المحیط)، امام بغوی (معالم التنزیل)، امام قرطبی (الجامع لاحکام القرآن) امام نسفی (مدارک التنزیل)، امام بیضاوی (انوار التنزیل)، امام سیوطی (جلالین ۶: ۴۸۵) اور ابن کثیر وغیرہ نے سات سے ۸۳ تک کے اعداد لکھے ہیں۔ مشہور عدد ۸۰ کا ہے۔ مولانا شبیر احمد عثمانی (تفسیر عثمانی) نے ''کم وبیش ۸۰'' کہا ہے۔ کم سے کم عدد جو سات کا آتا ہے وہ دراصل بائبل اور ہندو اساطیر

کا بیان ہے۔ بائبل میں ہے کہ حضرت نوحؑ کے علاوہ تین ''تیرے بیٹے، تیری بیوی اور تیرے بیٹوں کی بیویاں'' سفینہ کے مسافر تھے (تکوین ۱۸:۶)۔ ہندو اساطیر متسیا پران اور مہا بھارت کے مطابق ایک کشتی میں منومہاراج کے ساتھ سات نیک انسان اور دیگر جانور سوار تھے جو زندہ رہے تھے، باقی دنیا طوفان میں ختم ہوگئی تھی۔ ان ویدی اساطیر کے مطابق منو نام کے ایک حق پسند بزرگ (رشی، پیمبر) کو وشنو نے طوفان کی خبر دی تھی اور کشتی بنانے کا حکم دیا تھا۔

امام نسفی (مدارک التنزیل ۱۳۲:۲) نے سورہ ہود ۴۰:۱۱ کی تفسیر میں ایک حدیث کا حوالہ دیا ہے کہ نجات پانے والے افراد آٹھ تھے یعنی حضرت نوح، ان کے تین بیٹے ان کی بیویاں۔ مگر امام ابن حجر عسقلانی نے کہا یہ حدیث مرفوعاً ثابت نہیں ہے۔ یوں بھی عدد آٹھ نہیں سات ہی بنتا ہے۔ حضرت نوحؑ کی بیوی واعلہ کو شمار کیا جائے تو آٹھ ہوتے ہیں مگر قرآن حکیم کے مطابق واعلہ بھی واہلہ زوجۂ حضرت لوطؑ کی طرح کافرہ تھی (التحریم ۱۰:۶۶)۔ روایت ہے کہ کوئی شخص ایمان لاتا تو واعلہ زوجۂ نوحؑ کافروں کو خبر کر دیتی تھی۔ اب اگر حضرت نوحؑ کے علاوہ کل نو یا دس مسلمان مانے جائیں تو ابناء نوح اور ان کی بیویاں ملا کر چھ ہوگئے، تو باقی صرف تین چار ہی لوگ ایمان لائے تھے۔ اگر تین چار ہی آدمی ایمان لائے تھے تو معاشرہ میں اہل ایمان کی حیثیت کیا رہ گئی تھی کہ سرداران قوم کو ان کے ایمان کی خبر دی جاتی۔ لہٰذا ظاہر یہی ہے کہ کچھ ایسی بڑی تعداد ضرور تھی کہ واعلہ کو بار بار کافر سرداروں کو خبر دینی پڑتی تھی۔

ابن سعد (طبقات الکبریٰ ۴۹:۱) نے ۸۰ کا عدد لکھا ہے کہ حضرت نوح اور ان کے تین بیٹوں اور تین بہوؤں کے علاوہ ''تہتر متنفس اولاد شیثؑ میں سے تھے جو ان پر ایمان لا چکے تھے۔ کشتی میں ان سب کی مجموعی تعداد ۸۰ تھی''۔

کمزور طبقات کی نفسیات: اس سے ایک اور بات جو سمجھ میں آتی ہے کہ اہل ایمان تو فقراء اور مظلوم طبقہ ہی تھا۔ مفسرین نے ایک حدیث کی بناء پر ان سے موچی اور حجام جیسے لوگ مراد لیے ہیں۔ اگر یہ موچی اور حجام اہل ایمان تھے تو ظاہر ہے سرداروں اور چودھریوں سے بہتر اور برتر تھے۔ بہ صورت دیگر مشرک سرداروں کے متبعین کی حیثیت سے بدتر انسانوں میں شامل تھے۔ قاضی ثناء اللہ پانی پتی (تفسیر مظہری ۷۶:۱۲) نے سورہ نوح ۲۱:۷۱ کی شرح میں لکھا ہے کہ نچلے طبقے نے عموماً اپنے

ان سرداروں کا اتباع کیا جو اپنے مال پر مغرور اور کثرت اولاد پر نازاں تھے اور مال اور اولاد نے ان کی تباہی میں مزید اضافہ کر دیا تھا۔ یہاں کثرت اولاد سے یہ مراد بھی لی جاسکتی ہے کہ قوم کی اکثریت ان سرداروں کی اندھی پیروی کرتی تھی۔ معاشرہ میں نچلے اور متوسط طبقات ہی اکثریت میں ہوتے ہیں اور ان کی پیروی ہی کسی قوم کے ظالم سرداروں کی طاقت کا سبب ہوتی ہے۔ اس اکثریت کی حمایت کافر سرداروں کو حاصل تھی۔ لہٰذا ان فقراء میں سے بھی فقط ۴۷ لوگ ہی ۹۵۰ برس میں ایمان لائے تھے۔ تو مطلب یہ ہوا کہ معاشرہ میں غالب اکثریت میں ہونے کے باوجود خود مظلوم طبقات ظالم سرداروں سے زیادہ گمراہی کا شکار تھے اور اپنی گمراہی یا سرداروں کے خوف یا لالچ کی وجہ سے وہ لوگ بھی حضرت نوحؑ کے دشمن ہی نہیں ان کے خلاف ظالموں کے آلۂ کار بنے ہوئے تھے۔ اس لیے وہ سزا کے بھی زیادہ مستحق تھے اور انہیں آئندہ قوموں اور تہذیبوں کے لیے عمرانی سبق بھی بنانا ضروری تھا۔

بظاہر مادی طور پر کمزور طبقات کی یہ ذہنی یا اعتقادی کیفیت بعد کی تاریخ میں بھی تقریباً ہر قوم اور ہر تہذیب کا نقطۂ تذلیل رہی ہے خواہ اس تہذیب یا قوم کی مادی تعلیمی حالت اور ارتقائی کیفیت بظاہر کتنی ہی بلند کیوں نہ ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ معاشروں کے یہ کمزور طبقات ہی ظالم و جابر سرداروں، مہاجنوں، تاجروں، کاہنوں اور پروہتوں، پجاریوں کی معاشرتی برتری کا بھرم قائم رکھتے ہیں۔ یہ گمراہ نہ ہوں تو ظلم و تعدی کا محل ہی نہ بنے۔ ابو حیان اندلسی (بحر المحیط ۵: ۲۱۵) نے **هُم اَرَاذِلُنَا** (هود ۱۱: ۲۷) "وہ تو ہمارے رذیل لوگ ہیں" کی تفسیر میں لکھا ہے کہ **الفقير فهو سريع الى الاجابة و الانقياد** "نادار شخص بڑی جلدی حکم مانتا ہے اور اطاعت قبول کر لیتا ہے"۔ یہ حکم برداری حق کے لیے ہو تو ظلم کی جڑ کٹ جاتی ہے، اور باطل کی خاطر ہو تو ظالم زیادہ ہی ستم ڈھانے لگتا ہے۔ دونوں قسم کی مثالوں کے لیے تاریخ میں بہت دور تک جانا ضروری نہیں۔ خود عصر رواں ایسی مثالوں سے بھرا ہوا ہے۔ امام اندلسی (بحر المحیط ۸: ۳۳۴) نے سورہ نوح ۷۱ کی تفسیر میں لکھا ہے کہ قوم کے چودھری اور سردار حضرت نوح کے متبعین کو "عام لوگ اور سفلہ" (**عامتهم و سفلتهم** عوام اور نچلے طبقہ کے لوگ) کہہ کر رد کرتے تھے۔

بہرحال سفینۂ نوحؑ کے مسافروں کے بارے میں مشہور قول یہی ہے کہ حضرت نوحؑ کے

علاوہ یا ان سمیت اہل ایمان صرف ۸۰ تھے۔ امام نسفی (مدارک التنزیل ۱: ۹۵۵) کی ایک اور روایت کے مطابق ۴۰ مرد ۴۰ عورتیں تھیں۔ اس تعداد کو قبول کرنے کی ایک وجہ وہ تحقیق ہے جو سفینہ کی ساخت کی گفتگو میں آیندہ صفحات میں اپنے موقع پر پیش کی جائے گی۔

طوفان اور بائبل کا بیان: طوفان کے بارے میں بھی بیانات میں خاصا فرق ہے۔ امام طبری (جامع البیان فی تاویل القرآن) اور امام ابو حیان اندلسی (بحرالمحیط ۵: ۲۲۶) میں ایک حدیث کا حوالہ ہے کہ حضرت نوحؑ، اہل ایمان اور زمین کے جانور یکم رجب کو سفینہ میں سوار ہوئے اور اسی دن طوفان شروع ہوا۔ امام بغوی (معالم التنزیل ۲: ۱۷۹)، امام قرطبی (الجامع لاحکام القرآن ۳: ۳۶)، مولانا پانی پتی (مظہری ۶: ۳۳) نے قتادہؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ سفینہ ۱۰/ رجب کو روانہ ہوا اور ابن عساکر کی روایت سے چھ ماہ بعد ۱۰/ محرم کو کوہ جودی پر ٹھہرا اس حساب سے سات ماہ کی مدت بنتی ہے۔ امام طبری نے ابن اسحاق کے حوالہ سے لکھا ہے کہ سفر سال بھر کا تھا۔ ابن اسحاق نے دراصل بائبل کا بیان نقل کیا ہے جس میں مہینوں کی ترتیب بھی مختلف ہے۔ بائبل کے مطابق ماہ ایار (صفر) کی ۱۷/ کو سمندروں کے سوتے پھوٹ نکلے اور آسمان کی کھڑکیاں کھل گئیں اور چالیس دن چالیس رات زمین پر بارش ہوتی رہی اور پانی زمین پر ایک سو پچاس دن تک چڑھتا رہا (تکوین ۷: ۱۱-۱۲، ۲۴)۔ پھر گھٹتا رہا اور ایک سو پچاس دن کے بعد کم ہوا اور ساتویں مہینے (تشری/ رجب) کی ۱۷ ویں تاریخ کو کشتی اراراط کے پہاڑوں پر ٹک گئی۔ پانی دسویں مہینے (تیوت/شوال) تک برابر گھٹتا رہا اور دسویں مہینہ (تیوت) کی پہلی تاریخ کو پہاڑوں کی چوٹیاں نظر آئیں (تکوین ۸: ۱-۵)۔

قرآن حکیم نے ان تفصیلات کو اہمیت نہیں دی۔ بس اس جامع بیان پر اکتفا کیا کہ جب ظالم کیفر کردار کو پہنچ گئے تو حکم ہوا کہ اے زمین اپنا پانی پی لے اور اے آسمان تھم جا پانی برسانا بند کر؛ چنانچہ بارش بند ہوگئی اور (زمین پر) پانی کم ہوگیا، یوں کام پورا ہوگیا اور سفینہ جودی پر جا کر ٹھہر گیا (ھود ۱۱: ۴۴)۔

تہذیب سفینہ سے تغافل: اس سارے بیان میں قوم نوح کے تمرد و سرکشی، بدنہادی، کفر و ضلالت اور پانچ بتوں وَدّ، سُوَاع، یَغُوث، یَعُوق، نَسر (نوح ۷۱: ۲۳) کی پرستش پر اصرار، مال و دولت اور حشم و خدم کا غرور، حکومت و اقتدار کا طنطنہ تو بڑی حد تک سامنے آجاتا ہے مگر یہ واضح نہیں

ہوتا کہ وہ قوم اس قدر بددماغ کیوں ہوگئی تھی اور اللہ اور اس کے بھیجے ہوئے ایک نبی سے اس قدر دشمنی کے پیچھے کیا بات تھی۔ پھر نبی بھی کون؟ وہ جن کی ولادت بجائے خود معجزانہ تھی۔ مصحفہ اخنوخ کی رو سے حضرت نوحؑ کے حسن و جمال، شکل وصورت، وجاہت اور شان کریمانہ کا شہرہ تو ان کی ولادت باسعادت کے موقع ہی پر ہوگیا تھا۔ خاندانی اعتبار سے بھی وہ کسی سے کم تو کجا، ساری خلقت میں افضل اور برترین تھے۔ خاندان بھی کوئی ان کے مدمقابل نہیں تھا۔ ان کے خانوادہ میں ان کے تین اجداد حضرت ادریسؑ، حضرت شیثؑ اور حضرت آدمؑ انبیاء ہوئے اور باقی چھ بزرگ لمک، متوشلح، یارد، مہلالیل، قینان اور انوش۔ مومنین صالحین اور اولاد آدم کے ہادی اور سربراہ تھے۔

ان سارے سوالوں کا جواب ایک لفظ میں عصری تہذیب ہے۔ اور اس تہذیب کا مثبت معجزانہ مظاہرہ سفینہ نوح کی تعمیر میں نظر آتا ہے۔ اس سفینہ کا مطالعہ نہیں ہوا اور اسے اسرائیلی اساطیر کی نذر کردیا گیا: جیسا کہ امام بغوی نے قصۂ نوح علیہ السلام میں واقع باہم متعارض بیانات پر جامع تبصرہ میں فرمایا کہ ''سفینہ کے طول وعرض اور طبقات اور اس کے مسافروں نیز بعض کی تخلیق (جیسے شیر کے سر سے بلی کی تخلیق اور ہاتھی کی دم سے خنزیر کی پیدائش) کے بارہ میں باتیں جن کا ذکر طبری اور سیوطی نے بھی کیا ہے اسرائیلیات ہیں جو یہودیوں نے گڑھ لی تھیں اور رائج ہوگئیں نیز جاہلیت میں بھی معروف تھیں۔ اسلام آیا تو مسلمان اہل قلم نے بھی نیک نیتی سے ان کے ظاہری اختلافات کو بیان کردیا''۔

مگر اس کا نتیجہ یہ نکلا ان اسرائیلیات کو تمام تر اضطرابات کے باوجود سند قبول مل گئی اور قوم نوح اور سفینہ نوح کی ضروری تحقیق پر قرار واقعی توجہ نہ ہوسکی۔

عمرانی اور اعتقادی اغلاط: اس تہذیب کے آثار قرآن حکیم کے اجزاء میں ملتے ہیں۔ ان کی تحقیق سے پہلے موازنہ اور تاریخی وعمرانی اغلاط کی نشان دہی کی خاطر مناسب ہے کہ یہود ونصاریٰ کی بائبل کے متعلقہ حصوں پر ایک طائرانہ نظر ڈال لی جائے۔ عبری (یہودی) اور مسیحی بائبل کے ابتدائی اجزاء میں بڑی گہری مماثلت ہے۔ دونوں میں مذکور قصۂ نوحؑ میں کسی مہذب اور ترقی یافتہ قوم کا حوالہ نہیں ملتا۔ اس کے برعکس ایک نصف انسان/ نصف فرشتہ نسل کا ذکر خاصا مضحکہ خیز ہے۔

عبرانی زبان میں یہوواہ (یَاوَھُوَ) کا ایک صفاتی نام عادَون ہے اور عادونائی کا مطلب

میرا رب (رَبّی) ہوتا ہے۔ یہودی بائبل میں ہے کہ زمین پر انسانوں میں حسین و جمیل عورتیں پیدا ہوئیں تو ''ابنائے عاونائی'' (العیاذ باللہ، بمعنی ملائک) نے انہیں آسمان سے دیکھا، ان پر فریفتہ ہوگئے اور ایک فرشتہ کی سرکردگی میں بہت سے فرشتے زمین پر اتر آئے اور ان انسانی عورتوں سے اختلاط کیا جس سے نفیلیم (Nephilim) نامی سے ایک دیو پیکر جبار نسل پیدا ہوئی اور اس نئی نسل نے زمین کو فتنہ و فساد سے بھر دیا۔ فساد کی کوئی تفصیل بھی نہیں دی گئی اور نہ اس جبار قوم کے ظلم و جور یا گناہوں اور بدی کی کوئی وضاحت کی گئی۔ بس یہ کہا گیا کہ فتنہ و فساد دیکھ کر عادونائی (میرے خداوند) کو انسان کی تخلیق کا بڑا صدمہ ہوا (العیاذ باللہ) اور اس نے نسل انسانی کو ختم کرنے کا ارادہ کر لیا، سوائے نوح اور اس کے تین بیٹوں کے (کمپلیٹ جیوش بائبل/مسیحی نیو انٹرنیشنل نسخہ، تکوین ۶:۱۔۲۲)۔

ابن سعد کی تصحیح: ابن سعد (طبقات الکبریٰ ۱: ۴۷۔۴۸) نے یہ قصہ معقول انداز میں پیش کیا ہے۔ وہ یہ کہ قتل ہابیل اور قابیل کی مسلسل سرکشی کے باعث حضرت آدمؑ نے اولاد شیثؑ کو اولاد قابیل کے ساتھ میل جول رکھنے کی ممانعت کردی تھی۔ اولاد قابیل میدانوں میں بسی ہوئی تھی اور بنی شیث پہاڑ پر رہتے تھے۔ ان کے مرد حسین و جمیل ہوتے تھے اور عورتیں سادہ رو ہوتی تھیں۔ حضرت آدمؑ اور حضرت شیثؑ کے انتقال کے بعد ایک بار اولاد شیث کے ۱۰۰ مردوں نے طے کیا کہ نیچے میدانوں میں جا کر اپنے عم زادوں کی کچھ خیر خبر لیں۔ وہاں پہنچے تو دیکھا کہ قابیلی عورتیں بڑی خوبصورت تھیں۔ بنی قابیل میں پہلے ہی زنا کاری، شراب خوری اور فتنہ و فساد پھیل چکا تھا۔ قابیلی عورتوں نے بنی شیث کے مردوں کو روک لیا۔ جب یہ سو افراد واپس نہ آئے تو دوسرے سو لوگوں کے ایک گروہ نے مشورہ کیا کہ دیکھیں ان کے بھائیوں پر کیا گزری۔ وہ بھی پہاڑ سے اترے اور انہیں بھی قابیلی عورتوں نے اپنے دام میں پھانس لیا۔ اس واقعہ کے بعد دونوں قبیلوں میں باہمی مناکحت اور اختلاط کا رواج ہوا اور زمین پر فتنہ و فساد پھیل گیا۔ ابن سعد کا بیان ہے کہ اسی قوم پر طوفان نوح کا عذاب نازل ہوا تھا۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ پیرایہ بیان اور اصطلاحوں کے بے محل یا نامناسب استعمال سے کسی واقعہ کی تعبیر میں کتنا بڑا فرق پڑ جاتا ہے۔

بائبل کی روایت کئی مسئلہ پیدا کرتی ہے۔ زمین پر فساد ''ابنائے عادونائی'' (العیاذ باللہ)

نے پھیلایا تھا اور عادونائی کو تخلیق انسان سے رنج ہوا، سزا انسانوں بلکہ دیگر غیر مکلف مخلوقات کو دی گئی۔ دوسرے یہ کہ فرشتوں کو انسانوں سے بھی کمتر سطح پر اتار دیا گیا کہ وہ انسانی عورتوں پر فریفتہ ہوکر زمین پر اتر آئے اور عادونائی کی مرضی کے بغیر ان سے اختلاط کیا۔ کچھ اس قسم کی بات مصحفہ اخنوخ میں بھی وارد ہوئی ہے۔ ظاہر ہے یہ اساطیر مہمل ہیں۔ البتہ مصحفہ اخنوخ میں یہ اشارہ ضرور ہے کہ جب قابیل معتوب ہوا اور اپنے اہل وعیال کے ساتھ والدین سے جدا ہوا تو اس کی ذریت نے مادی ترقی کی وجہ سے شر وفساد پیدا کیا جس کی اصلاح پر اخنوخ حضرت ادریسؑ مامور ہوئے تھے۔

بنی قابیل کا مسئلہ: بنی قابیل کا مسئلہ یہ تھا کہ قابیل حضرت آدمؑ کی روحانی میراث کا حق دار نہ بن سکا اور علم الاسماء کی عملی شرح کے عنوان سے صرف مادی میراث ہی اپنی اولاد کو دے سکا تھا۔ مفسرین کہتے ہیں کہ قابیل سے گناہ ضرور سرزد ہوا تھا مگر وہ کافر نہیں ہوا تھا۔ حضرت ادریسؑ تک کے زمانوں میں قوم قابیل میں بھی عصیان تو تھا، کفر اور شرک نہیں پیدا ہوا تھا، اسی لیے حضرت ادریسؑ نے اس قوم کے خاتمہ کی بددعا نہیں کی تھی۔ چنانچہ سات انسانی نسلوں کے بعد حضرت ادریسؑ کے دور میں بنی قابیل نے مادیات میں ایک بڑا مقام بنالیا تھا۔ مگر چونکہ اس قوم کا فتنہ ابھی عذاب کا مستحق نہیں ہوا تھا۔ اس لیے حضرت ادریسؑ نے اس کی مادی ترقیات کے جواب میں ایسی معجزاتی ایجادات معاشرہ کو دیں کہ قابیلی قوم اپنی مادی تہذیب سے کوئی نقصان پہنچانے کے قابل نہیں رہ گئی تھی۔ حضرت ادریسؑ کی ایجادات ہی اس زمانہ میں فاسق قوم کو راہ راست پر نہیں تو کم از کم حدود کے اندر رکھنے کے لیے کافی تھیں۔

بنی قابیل کی مادی ترقیات بہت اہم ہیں۔ قرآن حکیم میں اس کی تفصیلات کے بجائے حضرت نوحؑ کے عہد میں قوم کے غرور وسرکشی کے بیان میں اس قوم کی ثروت وقوت کا اشارہ دے دیا گیا ہے۔ سورہ نوحؑ میں قوم کو جو یاددہانی کرائی گئی ہے اس میں جہاں تہدید وتنذیر کا پہلو واضح ہے وہاں بین السطور میں اس علم و دانش کی جانب بھی کھلے اشارات ہیں جو چند نسلوں پہلے حضرت ادریسؑ کے عہد میں انسانوں کو حاصل ہوا تھا۔ چنانچہ کہا گیا: اس نے تم کو مرحلوں میں بنایا ہے۔ کیا تم غور نہیں کرتے کہ اللہ نے کس طرح سات طبقوں میں آسمان اوپر تلے پیدا کیے اور ان میں چاند سے انعطاف نور کیا اور سورج کو روشن چراغ بنایا اور تمہیں زمین سے دھیرے دھیرے اگایا؛ اور پھر تم

کو اسی میں لوٹا دے گا اور پھر اسی سے دوبارہ نکالے گا۔ اور اللہ نے تمہارے لئے زمین کو فرش بنا دیا تا کہ تم اس کے کھلے راستوں میں چلو پھرو (نوح ۷۱: ۱۴۔۲۰)۔ بنی قابیل کی مادی ترقی کا ایک اندازہ قائم کرنے کے لیے بائبل کی طرف بھی توجہ کرنی پڑتی ہے جس میں مادی امور خاصی تفصیل سے بیان میں آتے ہیں۔ چنانچہ بنی قابیل کی مادی ترقی کے واضح اشارے اس میں مل جاتے ہیں۔

مادی تہذیب کا آغاز بنی شیث سے قابیل کی علاحدگی کا ذکر کرتے ہوئے بائبل میں ایک اہم بات سرسری طور پر کہہ دی گئی ہے۔ وہ یہ کہ قائن (عبرانی میں قابیل کا نام) اپنی بیوی کے پاس گیا اور وہ حاملہ ہوئی اور اس سے حنوک پیدا ہوا، اور اس (قابیل) نے ایک شہر بسایا اور اس کا نام اپنے بیٹے کے نام پر حنوک رکھا (تکوین ۴: ۱۷)۔ بائبل کے اردو نسخہ میں شہر، پروٹسٹنٹ فرقہ کے کنگ جیمس نسخہ اور جدید بین الاقوامی نسخہ، نیز یہودیوں کی ہیبر و انگلش بائبل میں سٹی (city) کا لفظ لکھا گیا ہے، آخر الذکر میں عبرانی لفظ عیر دیا گیا ہے۔ یہاں اتنا کہنا کافی ہے کہ تہذیب سے شہر بنتا ہے، تمدن سے تہذیب نہیں بنتی، شہر میں آکر تہذیب خاتمہ کے کنارہ پر لگتی ہے۔ یعنی حضرت آدمؑ کی دوسری ہی نسل میں مہذب اور متمدن زندگی کا تصور پیدا ہو گیا تھا جو انسیات (anthropology) کے مزعومات کی تردید کرتا ہے۔ ابنائے آدم میں تہذیب اور تمدن کی جبلی خواہش آیندہ آٹھ دس نسلوں میں بہت ترقی کر چکی تھی۔ کتاب تکوین کے اسی باب میں قابیلی نسلوں کا بیان ہے: قابیل کا بیٹا حنوک (اخنوخ) تھا، حنوک سے عیراد، اس سے محویائیل، اس سے متوشائیل اور متوشائیل سے لمک پیدا ہوا۔ (تکوین ۴: ۱۸) یہاں حنوک (اخنوخ Enoch) اور لمک جیسے ناموں سے حضرت ادریسؑ اور ان کے والد کے نام نہ سمجھے جائیں۔

دوسرا قابل ذکر نکتہ یہ ہے کہ قابیل نے بیٹے کے نام پر شہر کا نام رکھا اور پوتے کو شہری (عیراد) کہا، یعنی ملتِ قابیلی میں مدنیت اور مادی ارتقاء اور تہذیب کو خاصی اہمیت حاصل ہو گئی تھی۔ اس خیال کی تصدیق بنی قابیل میں لمک ابن متوشائیل کی اولاد کے ذکر میں ملتی ہے۔ بنی آدم میں لمک قابیلی غالباً پہلا شخص تھا جس نے دو بیویاں کیں۔ بائبل میں آتا ہے کہ لمک دو عورتیں بیاہ لایا۔ ایک کا نام عَدَہ اور دوسری کا نام ضِلّہ تھا۔ اور عَدَہ کے یابل (جَبَل) پیدا ہوا وہ ان (لوگوں) کا باپ تھا جو خیموں میں رہتے اور مویشی پالتے ہیں۔ اور اس کے بھائی کا نام یوبل (جُوبَل) تھا۔ وہ بین اور

بانسری بجانے والوں کا باپ تھا۔ اور ضِلَّہ کے (بطن سے) توبل قائن (تُبال قابیل) پیدا ہوا جو پیتل اور لوہے کے تیز ہتھیاروں کا بنانے والا تھا۔ اور تُبال قابیل کی بہن نَعمہَ تھی۔ (تکوین ۴: ۱۹۔۲۲)۔

دین اور دنیا کی کشمکش: تیسرا نکتہ ہے کہ لمک ابن متوشائیل کی بیوی عَدَہ سے اس کا ایک بیٹا جَبَل سادہ زندگی کا عادی تھا اور اس کی اولاد اپنے جداعلی قابیل کے بنائے ہوئے شہر کے بجائے چرواہوں کے خیموں میں مقیم ہوئی۔ قیاس ہے کہ یہ اپنے ابنائے عم بنی شیث کے دین و شریعت پر تھے اسی لیے تمدن کے مقابلہ میں بداوت کی سادگی کو پسند کیا۔ اس کے برعکس جَبَل کا ماں جائی بھائی جوبل اور اس کی اولاد گانے بجانے کے شوقین تھے۔ جدید اصطلاح میں وہ قبیلہ کلچر کا دلدادہ تھا۔ بائبل میں بھی اس موقع سے پہلے کہیں گانے بجانے اور بانسری وغیرہ سازوں کا ذکر نہیں آیا۔ اس قبیلہ کے آلات موسیقی میں کنگ جیمس نسخہ میں رباب اور ساز کے الفاظ ہیں، جدید بین الاقوامی نسخہ میں تاروں کے ساز اور بانسری کہا گیا ہے، کیتھولک بائبل میں رباب اور بانسری ہے۔ چنانچہ ان بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہی قبیلہ مختلف سازوں اور موسیقی کا موجد بھی ہوا۔

چوتھا نکتہ یہ ہے کہ بنی قابیل کے سردار لمک ابن متوشائل کا تیسرا بیٹا تبال قابیل جو دوسری بیوی ضِلَّہ کے بطن سے نَعمہَ کا بھائی تھا، ہتھیار بناتا تھا۔ یہ ہتھیار مختلف دھاتوں سے بنائے جاتے تھے۔ بائبل جدید بین الاقوامی نسخہ میں ان اسلحہ ساز دھاتوں کو لوہا اور کانسہ کہا گیا ہے، کیتھولک بائبل میں لوہا اور تانبہ کے الفاظ ہیں اور مسیحی کنگ جیمس نسخہ اور یہودیوں کی ہیبر وانگلش بائبل میں پیتل اور لوہے کا ذکر ہے۔ ایک عبرانی لغت کے مطابق اس زبان میں کانسہ، پیتل، تانبہ اور جست سب دھاتوں کے لیے نحوشت (نحاس) کا ایک ہی لفظ استعمال ہوتا تھا اسی لیے ہر نسخہ کے مترجم نے اپنی صوابدید کے مطابق کسی ایک دھات کا نام لکھ دیا۔ اگر ان ہتھیاروں کی ساخت میں پیتل استعمال ہو رہا تھا تو اس کا صاف مطلب ہے کہ بنی قابیل مختلف صنعتی دھاتوں کی کان کنی بھی کر رہے تھے اور تانبہ اور جست وغیرہ سے مرکب دھاتیں بنانے کی سائنس پر بھی انہیں دسترس حاصل ہو چکی تھی۔ مستقبل میں اس قوم کی مادی ترقی سے فتنہ و فساد میں غیر معمولی اضافہ ہونا مقرر تھا اس لیے اللہ نے

تین انسانی نسلوں کے بعد ایک عظیم المرتبت رسول پیدا فرمایا۔

پانچواں نکتہ یہ کہ بنی قابیل میں سے لمک بن متوشائیل بن محویائیل بن عیراد بن اخنوخ بن قابیل بن آدم اور بنی شیث کے عمود میں حضرت ادریسؑ اخنوخ بن یارد بن مہلالیل بن قینان بن انوش بن شیث بن آدم ہم عصر تھے۔ چنانچہ بنی قابیل کے لمک ابن متوشائیل کے تینوں بیٹے متوشلح بن اخنوخ (ادریسؑ) کے زمانہ میں موجود تھے۔اس تفصیل کا لب لباب یہ ہے کہ حضرت ادریسؑ کے زمانہ میں بنی قابیل شہر بسانے لگے تھے، گانا بجانا شروع ہو گیا تھا اور ان کی ہتھیار سازی سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ادریسؑ کی ایجاد تیغ کے بعد کفار سے جہاد کا آغاز ہوا تو اگلی نسل میں بنی قابیل ''تیز دھار کے ہتھیاروں'' کے ذریعہ جنگ وجدل کا تجارتی آغاز کر چکے تھے۔

اَرَاذِلُنَا کی تحقیق: یہ اندازہ کرنا دشوار نہیں ہے کہ بنی قابیل میں تبال قابیل بن لمک بن متوشائیل کی تیسری نسل جو حضرت نوحؑ سے مقابلہ آرا ہوئی تھی مادی ترقی کے کس درجہ پر ہوگی۔ قرآن حکیم میں قوم نوحؑ کی سخت دلی، تمرد، سرکشی اور غرور کا بیان بالواسطہ طور پر اس قوم کی مادی طاقت کا ثبوت ہے۔

چھٹا نکتہ یہ ہے کہ لمک کی پہلی بیوی عَدَہ کے بڑے بیٹے جَبَل کی سادگی پسند اولاد نے ظاہر ہے کوئی مادی ترقی نہیں کی تھی اور ان کا گزر بسر گلہ بانی پر تھا اور قیام خیموں میں۔ اس لیے حضرت نوحؑ پر ایمان لانے والے اسی قبیلہ کے غربا ہوں گے جن کو قوم نوح کے اشراف اور سرداروں نے اراذلنا کہا، یعنی وہ ان فقرا کو اگر چہ اپنے ہی لوگ سمجھتے تھے جیسا کہ اراذلنا میں نا کی ضمیر سے ثابت ہے، مگر برابری کا درجہ نہیں دیتے تھے۔

حضرت نوحؑ کا تعارف: امام قرطبی (الجامع لاحکام القرآن ۱۸: ۳۱۴) نے حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ حضرت نوحؑ کے آبا واجداد اور امہات میں حضرت آدمؑ اور حضرت حواؑ تک سب مومن تھے، کسی نے کفر نہیں کیا تھا (**لم یکفر**)۔ ان کا نام شاکر بتایا جاتا ہے۔ امام حاکم کی کتاب حدیث مستدرک میں روایت ہے کہ ان کا نام عبدالغفار تھا لیکن ذکر الٰہی کے دوران اور اپنی قوم کی اصلاح کی خاطر کثرت سے گریہ کرتے تھے اس لیے نوح لقب پڑ گیا تھا۔ یہ بیان مصحفہ اخنوخ سے مختلف ہے جہاں ان کا نام ہی نوح قرار دیا گیا ہے۔ امام جلال الدین سیوطی نے

الاتقان فی علوم القرآن میں لکھا ہے کہ ان کا ایک لقب سکن تھا کیونکہ طوفان کے بعد انہوں نے قوم کو ایک معتدل خطہ میں سکونت پذیر کیا تھا۔امام قرطبی (الجامع لاحکام القرآن ۱۸: ۲۹۸) کے مطابق حضرت نوحؑ کا نام ونسب تھا نوحؑ بن لمک بن متوشلح بن اخنوخ (ادریس) بن یارد بن مہلائیل (یا مہلائیل) بن قینان بن انوش بن شیث بن آدم علیہم السلام تھا۔امام پانی پتی (تفسیر مظہری ۴: ۲۲۳) نے ان کی والدہ کا نام عوفہ یا قینوس بنت برا کیل بن متوشلح بتایا ہے۔امام ابوحیان اندلسی (بحر المحیط ۸: ۳۳۷) اور امام بیضاوی (انوار التنزیل ۵: ۳۹۶) نے والدہ کا نام شمخاء بنت انوش لکھا ہے۔ یہ انوش بن شیث نہیں تھے۔ امام قرطبی (الجامع لاحکام القرآن ۱۸: ۳۱۳) نے اس نام کے ہجے شمخیٰ لکھے ہیں اور کہا ہے کہ قشیری اور ثعلبی نے بھی یہی کہا ہے۔تاہم حضرت نوحؑ کی والدہ کے نام کا یہ عبرانی تلفظ ہے۔عربی میں ان کے نام کا تلفظ سمحا بنت انوش تھا، جیسا کہ امام بغوی (معالم التنزیل ۸: ۲۳۴) نے لکھا ہے۔ایک قول یہ بھی ہے کہ ان کا نام ہیجل بنت لاموش بن متوشلح تھا اور وہ حضرت نوحؑ کی بنت عم تھیں۔امام قرطبیؒ نے علامہ ابوالحسنؒ ماوردی کے حوالہ سے والدہ کا نام منجل بھی لکھا ہے۔یہ اختلاف سقم کتابت کی وجہ سے بھی ہوسکتا ہے اور ایک سے دوسری زبان میں لفظ کو منتقل کرتے ہوئے لہجے کے فرق سے بھی ممکن ہے۔

امام قرطبی نے (الجامع لاحکام القرآن ۷: ۲۳۳) اور امام ابوحیان اندلسی نے بحر المحیط میں حضرت ابن عباسؓ سے روایت کی ہے کہ حضرت نوحؑ کو ۴۰ سال کی عمر میں نبوت ملی تھی۔امام قرطبی (الجامع لاحکام القرآن ۱۸: ۲۹۸) اور امام عبداللہ النسفی (مدارک التنزیل ۱: ۹۵۴) نے لکھا ہے کہ ۵۰ سال کی عمر میں نبوت عطا ہوئی تھی۔مقاتلؒ نے ۱۰۰ سال بتائی ہے، ایک روایت ۲۵۰ سال کی ہے، عون بن شدادؒ نے ۳۵۰ سال اور وہبؒ نے ۴۰۰ سال کہی ہے۔امام ابوحیان اندلسی نے یہ بیانات بحر المحیط میں یکجا کردئے ہیں۔ابن سعد (طبقات الکبریٰ ۱: ۴۹) کا بیان ہے کہ عمر ۴۸۰ برس تھی اور وہ ۱۲۰ سال تک قوم کو ہدایت کرتے رہے، اور جب کشتی بنانے کا حکم ہوا تو وہ ۶۰۰ برس کے تھے اور طوفان کے بعد ۳۵۰ سال زندہ رہے۔ یہ تفصیل کہ طوفان کے وقت ان کی عمر ۶۰۰ سال تھی بائبل سے نقل کی گئی ہے۔اس کے مقابل قرآن حکیم میں صاف صاف کہا گیا ہے کہ: اور ہم نے نوح کو ان کی قوم کی طرف بھیجا سو وہ ان کے درمیان پچاس سال کم ایک ہزار برس رہے اور قوم کو

سمجھاتے رہے۔ پھر (قوم کو) طوفان نے پکڑ لیا (العنکبوت ۲۹: ۱۴)۔

قرآن حکیم قوم نوح کے بارے میں کچھ امور پر واضح گفتگو کرتا ہے۔

اس پر تمام علماء کا اتفاق ہے کہ قوم نوح کے اشراف، سرداروں اور چودھریوں نے دین قبول نہیں کیا تھا بلکہ وہ اسلام اور اصلاح کے شدید مخالف تھے۔ امام ابوحیان اندلسی (بحر المحیط ۴: ۳۲۴) نے اس قوم کی خصوصیات تین فقروں میں بیان کی ہیں: ان کی عقلیں دنیا میں ڈوبی ہوئی تھیں، انہیں حکومت و ریاست کی ہوس تھی، وہ معاشرتی برتری کے غرور میں مبتلا تھے۔ قرآن حکیم میں اس مغرور طبقہ کے لیے الملاء کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے، جس کا مطلب تفسیر جلالین (۲: ۳۷۴) میں اشراف اور مولانا مفتی محمد شفیع (معارف القرآن ۳: ۵۹۳) نے برادریوں کے چودھری بتایا ہے۔ امام راغب اصفہانی (مفردات الفاظ القرآن ۷۷۶) نے ایسی جماعت مراد لی ہے جو اپنے ظاہر سے انسانوں کی آنکھوں کو پھیر دے اور جس کی ہیبت وجلال کے سامنے لوگ بے بس ہو جائیں۔

چودھریوں کی بددماغی: اس گروہ کی بدد ماغی کا یہ حال تھا کہ حضرت نوحؑ پر ایمان لانے والوں کی معاشرتی توہین سے بھی باز نہیں آتے تھے۔ وَمَا نَرٰکَ اتَّبَعَکَ اِلَّا الَّذِیۡنَ ھُمۡ اَرَاذِلُنَا بَادِیَ الرَّأْیِ (ہود ۱۱: ۲۷) ''اور ہم دیکھتے نہیں کوئی بے سوچے سمجھے تابع ہوا ہو تیرا مگر جو ہم میں نیچ قوم ہے''۔ تفاسیر میں اَرَاذِلُنَا کا مطلب موچی اور حجام بیان کیا گیا ہے۔ ہندو معاشرہ میں بھی یہ کام کرنے والے حقیر سمجھے جاتے ہیں، لیکن اگر بنی قابیل کے سردار لمک بن متوشائیل کی بیوی عَدَہ کے بیٹے جَبَل کی اولاد کی سادہ اور جفاکشی کی زندگی ملحوظ رہے تو ان کے دولت مند عم زاد بھائیوں کا حقارت آمیز سلوک سمجھ میں آتا ہے، خصوصاً اگر بنی جبل میں اہل ایمان بھی ہوں۔ سورہ ہود کی تفسیر میں علامہ ابوحیان اندلسی (بحر المحیط ۵: ۲۱۵) نے کہا ہے کہ براہمہ کا مذہب یہ ہے کہ وہ علی الاطلاق نبوت کا انکار کرتے ہیں اراذل کے اتباع سے انہیں عار آتی ہے، جو نہ تو برابری کے جوڑ ہوتے ہیں اور نہ سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اس بیان کی روشنی میں بعینہ یہی صورت غزوۂ بدر کے موقع پر بھی پیش آئی تھی جب مشرک قریشی سردار عتبہ بن ربیعہ نے حقارت سے مدینہ کے کاشتکاروں سے لڑنے سے انکار کر دیا تھا (ابن سعد۔ طبقات الکبریٰ ۱: ۲۵۵)۔ قریشی

دولت مند تاجر تھے۔قوم نوح کے دولت مند تاجر بھی چرواہوں کو حقیر اور رذیل سمجھتے تھے؛ وہ موچی اور حجام ہوں تو اور بھی کمتر ہوئے۔

بزرگ مفسرین نے اس لفظ کی شرح میں بڑی دقت نظر سے کام لیا ہے۔امام بغوی (معالم التنزیل ۴:۱۷۱) میں بتاتے ہیں کہ اشراف اور رؤسائے قوم حضرت نوحؑ کے اصحاب کو سفلہ یعنی خاک بسر اور نچلے لوگ کہتے تھے۔امام اندلسی (بحر المحیط ۵: ۲۱۵) نے النحاس کا قول دیا ہے کہ وہ فقراء تھے ''جن کا کوئی حسب نہیں'' تھا۔یعنی سرداران قوم ان کے نسب پر طعن نہیں کرتے تھے مگر حسب کو قابل مذمت سمجھتے تھے۔ان کا گمان تھا کہ ریاست اشراف کا حق ہے اور محنت مزدوری (صعوبۃ) کرنے والے اس منصب کے اہل نہیں ہوتے۔مولانا تھانوی (بیان القرآن ۴۶۶) نے کہا کہ چودھریوں کی رائے میں کم حوصلہ لوگوں کی اغراض حصول مال کی ہوتی ہیں اسی کو وہ ان کے ایمان لانے کا سبب سمجھتے تھے۔امام اندلسی (بحر المحیط ۵:۲۱۶) نے علامہ محمود زمخشری کے حوالہ سے مزید لکھا ہے کہ قوم نوح کے نزدیک جاہ و مال پر شرف ختم تھا،جبکہ اراذل دنیوی امور میں پچھڑے ہوئے جہال سمجھے جاتے تھے جنہیں امور دنیا کی ہوا تک نہیں لگی تھی۔امام بیضاوی (انوار التنزیل ۳: ۲۳۰) نے بھی سرداروں کے حوالہ سے یہی بات لکھی ہے کہ ان غرباء کو دنیا کی کچھ ظاہری معلومات ہیں مگر دنیوی علم ان کے پاس نہیں ہے، گویا عصری تقاضوں سے ناواقف ہیں اور حیات دنیا پر بادئ الرائے (ظاہری نظر) کے سوا کسی بات کی خبر نہیں رکھتے۔مولانا شبیر احمد عثمانی (تفسیر عثمانی ۲:۱۳۱) نے لکھا کہ رؤسائے قوم حضرت نوحؑ کو طعنہ دیتے کہ تم دولت مند، جاہ و حکومت کے مالک ہوتے تو کچھ بات تھی،تم بطور انسان تو برابر کے ہو مگر تمہیں ہم پر کوئی فضیلت نہیں اور تمہارے پیرو بھی رذیل ہیں۔

اہل ایمان کے بارے میں تہذیب گزیدہ خود پسند اشراف طبقوں کی ہمیشہ یہی رائے رہی ہے۔یہاں ظاہر ہوتا ہے کہ اس ذہنیت کی تاریخ بہت قدیم ہے۔ایسے مالدار لوگوں کی ایک اور پہچان اللہ تعالیٰ نے یہ بتائی ہے کہ وہ اپنا مال اللہ کے راستے سے لوگوں کو روکنے میں صرف کرتے ہیں (الانفال ۸:۳۶)۔

ایمان و کفر کا عمرانی فرق رہی بات دعوت ایمان کی تو گمراہ سرداروں نے کہا ''ہم نے تو اپنے

آباء سے ایسی باتیں سنی نہیں'' (المومنون ۲۳: ۲۳۔ ۲۴)۔ وہ جھوٹ بولتے تھے۔ ابھی کچھ دن پہلے تک حضرت نوحؑ کے والد لمک اور دادا متوشلح حیات تھے اور وہ ایک اللہ کے عبادت گزار تھے۔ اس سلسلہ میں اگر بائبل (تکوین ۵: ۲۔ ۲۳) کے بیان کو مان لیا جائے تو حضرت نوحؑ کی ولادت کے وقت تو حضرت آدمؑ بھی حیات تھے، اس وقت ان کی عمر ۱۰۵۶ سال تھی اور طوفان سے ۱۲۴ سال پہلے ان کا انتقال ہوا تھا۔ اسی بیان کے مطابق طوفان کے وقت دیگر آبائے نوحؑ یعنی لمک، متوشلح، یارد اور مہلائیل بھی حیات تھے اگرچہ بائبل نجات پانے والوں میں ان میں سے کسی کا تذکرہ نہیں کرتی۔ بائبل کی یہ الحاقی یا خلاف واقعہ عبارت سردست مورد بحث نہیں، نکتہ صرف یہ ہے کہ قوم نوحؑ کا یہ کہنا کہ ہم نے تو اپنے آباء سے ایسی باتیں سنی نہیں صریح جھوٹ تھا۔ قرآن حکیم میں تو صاف ہے کہ قوم نوح نے جب رسولوں کا انکار کیا تو انہیں غرق کر دیا گیا (الفرقان ۲۵: ۳۷)، یعنی انکار فقط حضرت نوحؑ کی نبوت کا نہیں حضرت ادریسؑ، حضرت شیثؑ اور خود حضرت آدمؑ کی نبوت کا بھی تھا کیونکہ اللہ کی وحدانیت پر ایمان رکھنے والوں سے وہ سب واقف تھے۔ ان کا اصل مسئلہ مال و دولت کا تھا۔ مولانا مفتی محمد شفیعؒ (معارف القرآن ۳: ۵۹۵) نے سورۃ المومنون کی آیات کی شرح میں لکھا ہے کہ روسائے قوم کہتے تھے ہماری ہی قوم اور نسل کا ایک آدمی ہم پر اپنا تفوق اور بڑائی قائم کرنا چاہتا ہے۔ یہ بات عقلی طور پر بچکانا تھی۔ آخر سارے چودھری بھی تو اسی نسل اور قوم کے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ حضرت نوحؑ نسب کے لحاظ سے کمتر نہیں تھے۔ تو اگر وہ لوگ اس قوم اور نسل کے ہو کر سرداری کرتے تھے تو حضرت نوحؑ کے لیے اس میں کیا عیب تھا۔ بات یہ تھی کہ علاوہ شرک کی روک ٹوک کے حضرت نوحؑ غلط طریقوں سے مال اندوزی کی اجازت بھی نہیں دیتے تھے اور ان کے پاس حرام مال نہیں تھا۔ یہی چودھریوں کے اختلاف کا بنیادی سبب تھا۔

دیوتا سازی کی معاشرتی وجہ: بنیادی مسئلہ عقیدۂ توحید کا تھا۔ بظاہر تو خداؤں اور دیوتاؤں کی کثرت کی قائل کسی قوم کے لیے ایک اللہ کا مان لینا سہل ہونا چاہیے۔ لیکن سب سے بڑی رکاوٹ جو تاریخ سے ثابت ہے یہ کہ دیوتاؤں کی کثرت نہ تو حرام کاری سے روکتی ہے نہ حرام ذرائع سے مال کمانے پر پابندی لگاتی ہے، بلکہ ایسے کاموں کا جواز پیدا کرنے کے لیے حسب ضرورت کوئی نیا بت تخلیق کر لیا جاتا ہے جو دولت کمانے لیے جوا، دھوکہ، فریب وغیرہ کی اجازت دے دیتا

ہے یا خود اپنی اساطیری بدفعلیوں سے قوم کو حرام کاری کے فروغ کی دلیل مہیا کر دیتا یا کر دیتی ہے۔ اس کے برعکس ایک اللہ پر ایمان کے ساتھ یہ تمام حرکات غیر قانونی ہو جاتی ہیں اور گمراہ قومیں ڈرتی ہیں کہ ان پابندیوں سے ان کی تہذیب و ترقی کا خاتمہ ہو جائے گا۔ چنانچہ قوم نوحؑ کے سرداروں نے عوام کو ورغلایا کہ خبردار، اپنے پانچ بڑے دیوتاؤں پر بھروسہ رکھو، کیونکہ یہ ایک معبود کی بات تو بڑی عجیب ہے۔ (ص ۳۸:۶-۱۲)

امام طبری (جامع البیان ۲۳:۶۳۹) نے عکرمہؒ سے روایت کی ہے کہ آدمؑ و نوحؑ کے درمیان دس قرن (صدیاں) گزرے تھے اور اس مدت میں تمام انسان ایک ہی دین پر تھے اور ایک اللہ کی عبادت کرتے تھے۔ اس کے بعد بت پرستی شروع ہوئی اور سب سے پہلے متذکرہ بالا پانچ بتوں کی پوجا کا رواج پڑا۔ قرآن حکیم (نوح ۷۱: ۲۳) کی تفسیرات میں ان بتوں کے بارے میں روایات جمع کر دی گئی ہیں۔ ان کا لب لباب یہ ہے کہ قوم نوح کئی بتوں کو پوجتی تھی۔ ان میں پانچ بڑے بتوں کے نام تھے وَدّ، سُواع، یغوث، یعوق اور نسر۔ ان بتوں کی اصل کے بارے میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ، محمد بن کعب قرظیؒ اور محمد بن قیسؒ کی روایات تقریباً تمام مفسرین نے نقل کی ہیں۔ ان روایات میں مشترکہ نکتہ یہ ہے کہ یہ پانچ افراد حضرت آدمؑ اور حضرت ادریسؑ کی درمیانی مدت کے صالحین اور علماء میں سے تھے اور ان کے انتقال کے بعد معتقدین اور مقتدیوں نے یادگار کے طور پر ان کے بت بنا لیے تھے اور ان کو مسجد میں یا اس کے آس پاس عزت کی جگہ پر نصب کر دیا تھا۔ دو ایک نسل کے بعد ابلیس کے بہکانے پر لوگ اللہ کو بھول کر ان بتوں کی پرستش کرنے لگے۔

ان پانچ کی اصل کے بارے میں مختلف روایات ہیں۔ وہ آدمؑ و نوحؑ کی درمیانی مدت کے صالحین میں تھے (امام نسفی، مدارک التنزیل ۳: ۹۶۴)؛ انہیں قوم نوح میں شمار کیا جاتا ہے (امام محمود آلوسی، روح المعانی ۲۹: ۷۷)؛ حضرت ادریسؑ کے ارشد تلامذہ میں تھے (محمد مالک کاندھلوی، معارف القرآن/ ادریسی ۸: ۲۵۴)؛ حضرت شیثؑ کو وَدّ اور باقی چار کو ان کی اولاد کہا گیا ہے (ابن کثیر: تفسیر ۸: ۲۳۵-۲۳۶)؛ (امام قرطبی، احکام القرآن ۱۸: ۳۰۷-۳۱۰؛ ابن کثیر بحوالہ ابن عساکر، تاریخ دمشق مخطوطہ ۸: ۶۵)۔ ابن کثیر نے ابن عساکر (تاریخ دمشق مخطوطہ ۸: ۱۵۶)

کے حوالہ سے انہیں حضرت آدمؑ کے ۲۰ بیٹوں میں شمار کیا ہے۔ ابن عساکر کا قول ہے کہ ابناء آدم میں جو افراد قابل ذکر ہوئے اور طویل مدت زندہ رہے ان میں ہابیل، قابیل، صالح اور عبدالرحمٰن تھے جن کا پہلا نام عبدالحارث تھا، البتہ مفسرین اس مشرکانہ نام کی تردید کرتے ہیں۔ ابن کثیر مزید کہتے ہیں کہ وَدّ ہی حضرت شیثؑ تھے جن کا لقب ہبۃ اللہ تھا۔ وہی اپنے تمام بھائیوں کے سردار (سید) تھے اور سواع، یغوث، یعوق اور نسر ان کی اولاد میں تھے۔ زمخشری (الکشاف ۱۱۴۳-۱۱۴۴) کا قول ہے کہ یہ پانچوں اولاد آدمؑ سے تھے۔ محمد ابن کعب کی روایت میں بھی ان پانچوں کو حضرت آدمؑ کے ۲۰ بیٹوں میں ممتاز افراد کہا گیا ہے۔ امام بیضاوی (انوار التنزیل ۵:۳۹۵) اور امام عبداللہ نسفی (مدارک التنزیل ۳: ۹۶۴) انہیں آدم ونوح کی درمیانی مدت کے لوگوں میں شمار کرتے ہیں۔ امام محمود آلوسی بغدادی (روح المعانی ۲۹:۷۷) نے ایک روایت دی ہے کہ یہ پانچوں قوم نوح کے افراد تھے۔ مفسرین کا اتفاق ہے کہ یہ پانچوں صالح اور برگزیدہ لوگ اور بنی آدم کے ہادی اور رہنما تھے۔

قوم نوحؑ کے پانچ بڑے بت: امام قرطبی (احکام القرآن ۱۸:۳۰۹) نے بحوالہ واقدی اور شیخ عبدالحق حقانی (تفسیر حقانی ۷:۲۵۲) نے بتایا ہے کہ ان پانچ میں وَدّ کا بت مرد کی شکل کا تھا، سواع عورت کی مورتی تھی، یغوث بیل کی شکل کا تھا، یعوق گھوڑے کی تمثال تھا اور نسر گدھ یا عقاب کی صورت کا تھا۔ ایک عرصہ دراز کے بعد یہ پانچوں دیوتا جاہلی عربوں میں بھی پوجے جانے لگے تھے۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ پہلے دو کے علاوہ باقی بھی تو انسان تھے پھر ان کے بت جانوروں کی شکلوں میں کیوں بنا دیے گئے۔ روایات کی غیر موجودگی میں اس سوال کا کوئی واضح جواب تو نہیں دیا جا سکتا البتہ ممکن ہے کہ بعد کے زمانہ میں ان اشخاص کی ذاتی خصوصیات یا نام کی وجہ سے ان کے بتوں کی یہ شکلیں بنی ہوں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ جانوروں کے نام پر ان کے نام رکھ دیے گئے ہیں جیسے موجودہ زمانہ میں بھی اسد، فہد، شاہین، اور مغربی لوگوں میں وولف (بھیڑیا-Wolf)، اُرسلا (ریچھنی-Ursula)، لیو (شیر یا اسد-Leo) نام ہوتے ہیں۔ مولانا عبدالماجد دریابادی (گ: تفسیر ماجدی ۴۲۹) وضاحت کرتے ہیں کہ مرد کی شکل میں وَدّ قوت مردانہ کا نشان تھا اور

عورت کی صورت میں سواع تلون مزاجی اور حسن کی علامت تھی۔ یغوث شیر ببر کی صورت میں وحشیانہ طاقت کا مظہر تھا اور گھوڑے کی شکل کا یعوق تیز رفتاری کی علامت تھا۔ نسر خواہ کرگس ہو یا عقاب دور بینی اور باریک نگاہی کا نشان تھا۔

ایک قابل ذکر بات یہ ہے کہ عہد جاہلیت سے پہلے بھی فراعنہ کے زمانہ میں مصر میں عقاب کی شکل کا ایک دیوتا حورس (Horus) نامی تھا۔ عقاب آج تک مصر کا سرکاری نشان ہے اور امریکہ کا سرکاری نشان بھی یہی نسر ہے۔ فرعونی مصر میں بیل کی شکل کے آبیس (Apis/Hapis) دیوتا کی پوجا بھی ہوتی تھی۔ ایزیس (Isis) نامی عورت کی شکل کا ایک بت اور بھی پوجا جاتا تھا جو ممکن ہے سواع کا قبطی روپ ہو۔ اس بت کی پوجا قدیم یونان سے روم تک ہوتی تھی۔ ممکن ہے قدیم رومی/ جدید فرانسیسی عیسائیوں کی دیوی لبرٹی (آزادی - Liberty) اسی سواع یا ایزیس کا ایک مختلف یورپی روپ ہو۔ مولانا عبدالماجد دریابادی (ر: تفسیر ماجدی ۱۱۳۱) نے ود کو قوت مردانہ اور عشق ومحبت کا دیوتا لکھا ہے اور سواع کو حسن ومحبوبی کی دیوی بتایا ہے، نیز جولس ولہاوسن (م: ۱۹۱۸-Julius Wellhausen) کے حوالہ سے (گ: تفسیر ماجدی ۴۳۰) لکھا ہے کہ جاہلی عربیہ میں نابغہ ذبیانی کی شاعری میں وَدّ کو عورتوں کے ساتھ اچھل کود کرنے والے دیوتا کے طور پر پیش کیا گیا تھا۔

طوفان نوحؑ میں یہ بت غرق ہو گئے تھے۔ ایک مدت دراز کے بعد مکہ میں جب بنی خزاعہ کے سردار عمرو بن لحئی نے بت پرستی کا آغاز کیا تو ایک روایت کے مطابق شیطان نے یہ بت زمین سے نکال کر عربوں میں ان کی پوجا رائج کردی تھی۔ ایک روایت یہ ہے کہ قوم نوح کے یہ بت لکڑی، پتھر اور مٹی سے بنائے گئے تھے۔ بعد میں دھاتوں سے ڈھال لیے گئے تھے۔ امام قرطبی (احکام القرآن ۱۸: ۳۰۷) نے بیان کیا ہے کہ ابوعثمان النہدی نے سیسہ سے بنا ہوا یغوث کا بت دیکھا تھا، نیز محمد ابن کعب کے حوالہ سے لکھا ہے کہ ابلیس نے پیتل اور سیسہ سے یہ بت ڈھالے تھے۔ شاید اسی لیے بعض مشرک اقوام میں پیتل اور زرد رنگ کو مذہبی تقدس حاصل ہے۔

شدت اعتقاد کا نتیجہ: ابن کثیر (ع: تفسیر ۸: ۲۳۵-۲۳۶ر ۲۹: ۶۱۸-۶۱۹) نے محدث ابن ابی حاتم کی روایت ابوجعفر کے حوالہ سے دی ہے کہ وَدّ ایک دین دار مرد اور قوم کا محبوب تھا۔ جب اس کا انتقال ہوا تو ارض بابل میں اس کی قبر پر ایک خیمہ تان دیا گیا جہاں بیٹھ کر لوگ اس کا

ماتم کرتے تھے۔ ابلیس نے ان لوگوں کے لیے ودّ کا ایک یادگاری بت بنایا تھا۔ کچھ مدت کے بعد کہا یہ ایک بت سب کو کافی نہیں، کہوتو ہر گھر کے لیے ایسے بہت سے بت بنادوں تا کہ گھر بیٹھے اس محبوب کو یاد کیا کرو۔ لوگوں کو یہ بات پسند آئی اور یوں گھر گھر یہ برائی پھیل گئی۔ بعد کی نسلوں میں اسی سے عام بت پرستی کا آغاز ہوا۔

مولانا محمد مالک کاندھلوی (معارف القرآن/ادریسی ۸: ۲۵۴-۲۵۵) کا بیان ہے کہ حضرت ادریسؑ سے علوم حاصل کرنے والے ان کے پانچ خاص تلامذہ وَدّ، سواع، یغوث، یعوق اور نسر تھے۔ جب حضرت ادریسؑ کو زندہ آسمان پر اٹھالیا گیا تو ان کے یہ تلامذہ اور خدام اخنوخ کے فراق میں انتہائی غمگین اور رنجیدہ تھے، مگر اللہ کی عبادت کرتے اور لوگوں کو اللہ کے دین اور ایمان وتوحید کی تعلیم دیتے رہے۔ مزید کچھ عرصہ گزرنے پر یہ لوگ بھی دنیا سے گزر گئے تو ان سے علم اور دین حاصل کرنے والے لوگ متحیر اور پریشان ہوئے اور سوچنے لگے کہ اب علم اور دین کس سے حاصل کریں۔ اسی عرصہ میں ایک گروہ نے لوگوں کے سامنے تجویز رکھی کہ یہ پانچ رہنما اور ہادی تھے تو ان کی یاد تازہ رکھنے کے لیے ان کے مجسمہ بنالیں۔ چند نسلوں بعد ان کی اولاد اور نئی نسل کے زمانہ میں ابلیس آیا۔ بعض روایات سے معلوم ہوا کہ اس نے ان مجسموں کے ذریعہ یہ آواز لگائی کہ اَنَا رَبُّکُمْ وَ رَبُّ اٰبَآئِکُمْ ''میں تمہارا رب اور تمہارے آباء واجداد کا رب ہوں''۔ ان لڑکوں نے یہ تو دیکھا ہی تھا کہ یہ مجسمے بڑی تعظیم وتکریم سے مخصوص جگہوں پر نصب کیے ہوئے تھے اور اپنے بزرگوں کو بھی ان کی تعظیم کرتے بھی دیکھا تھا۔ اس نسل کو تعظیم اور عبادت کا فرق معلوم نہ ہوا۔ پس یہ نسل ان بتوں کی عبادت کرنے لگی۔

تہذیب اور سرمایہ داری کا جوڑ: حضرت نوحؑ نے جب قوم کو ان بتوں کی پرستش سے روکا تو جو ردعمل سامنے آیا وہ بجائے خود سفاہت اور جہالت کا نمونہ تھا۔ سرداروں نے کہا کہ اول تو تمہارے پیرو سب معمولی لوگ ہیں، پھر تمہیں ہم پر کوئی فضیلت مال وغیرہ کی بھی حاصل نہیں، بلکہ ہم تو تمہیں جھوٹا سمجھتے ہیں۔ ان تمام الزامات میں ایک بات بھی بت پرستی کے حق میں کوئی دلیل نہیں تھی حالانکہ مسئلہ یہ تھا ہی نہیں کہ حضرت نوحؑ کا اتباع کون کرتا ہے یا انہیں سرداروں پر کسی قسم کی فضیلت اور فوقیت حاصل ہے کہ نہیں۔ رہی بات جھوٹا سمجھنے کی تو اس کا بھی کوئی ثبوت پیش نہ کیا۔

عام معاشرتی حالت میں جو لوگ مادی ترقی کے بلند مقام پر پہنچ جاتے ہیں ضروری نہیں کہ زندگی کے باقی معاملات میں بھی ذہانت اور معقولیت سے بات کر سکیں۔ کفار کے سارے الزامات کا جواب حضرت نوحؑ نے یہی دیا تھا کہ وہ کوئی معاضہ اور مال نہیں مانگتے اور یہ کہ انہوں نے یہ کب کہا کہ ان کے پاس اللہ کے خزانے ہیں، یا انہیں غیب کا علم ہے یا وہ فرشتہ ہیں۔ (ہود ۱۱:۳۱)۔

بت پرستی کا ایک بڑا مادی فائدہ ہیکلوں میں بتوں کے چڑھاوے ہوتے ہیں جن سے بت خانوں میں کثیر مال جمع ہو جاتا ہے اور پروہتوں اور کاہنوں کی حرص وہوس کی تکمیل کا سبب بنتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ کے ہر دور میں اور دنیا کی ہر مشرک قوم میں کاہن، پروہت اور عبادت گاہوں کو چلانے والے ان مروجہ طریقوں کو بدلنے کی سخت مخالفت کرتے آئے ہیں۔ ان کے برعکس توحید کو اختیار کرنے کے لیے انبیاء نہ تو لوگوں کو مالی رشوتیں پیش کرتے تھے اور نہ اپنی خدمت کا ان سے کوئی معاوضہ طلب کرتے تھے جیسا کہ بت خانوں کے پروہتوں کا دستور رہا ہے۔

قوم کو حضرت نوحؑ کا جواب ایک لطیف نکتہ پر متوجہ کرتا ہے۔ مادیت پر مبنی زندگی کی ایک بہت بڑی ضرورت سرمایہ ہوتا ہے۔ تہذیبوں کی بقاء اور ارتقاء اور استمرار کا تمام تر انحصار سرمایہ پر ہوتا ہے۔ ہر تہذیب کو ہر زمانہ میں نئی منصوبہ سازی اور منصوبوں کو روبہ کار لانے کے لیے بار بار بھاری مال کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ کے ہر دور میں تہذیبوں کے نظام حل وعقد پر ہمیشہ اہل زر کا تسلط رہا ہے، اگر چہ کسی بھی تہذیب کے آغاز میں اور اس کی تشکیل میں اس طبقہ کا کوئی ہاتھ نہیں ہوتا اور اس لیے نہیں ہوتا کہ تہذیب کے آغاز میں اس طبقہ کا وجود ہی نہیں ہوتا۔ یہ طبقہ تو تہذیب کے نتیجہ میں پیدا ہوتا ہے۔ تہذیب جس قدر مادی اور ابتکاری، ایجادی، اختراعی ہوگی اتنا ہی بڑا اور طاقت ور سرمایہ دار طبقہ پیدا کرے گی۔

(باقی)

قرون وسطیٰ کے مسلمانوں کے سائنسی کارنامے

جناب غلام نبی کشافی

پندرہویں صدی عیسوی کے بعد ہی یورپ نے موجودہ ترقی کی راہ پر قدم رکھا۔ جسے ''نشاۃ ثانیہ'' کہا جاتا ہے۔ ازمنہ وسطیٰ کو ''زمانہ اوسط'' قرن وسطیٰ اور عہد متوسط بھی کہا جاتا ہے۔ یہی زمانہ امت مسلمہ کے عروج وارتقاء اور علمی تفوق و برتری کا زمانہ ہے۔ جس کے نتیجے میں زندگی کی ہر جہت اور ہر شعبہ میں مسلمانوں کی علمی خدمات، کمالات اور ایجادات کے اثرات کا سلسلہ آج تک دراز ہے۔

قوموں کے عروج وزوال کی تاریخ بتاتی ہے کہ دنیا میں کسی بھی قوم کو عروج صرف اس کی علمی برتری اور قابلیت کی بنیاد پر ملتا ہے۔ قرون وسطیٰ میں عرب مسلمانوں کو زندگی کے ہر میدان میں جو برتری حاصل تھی وہ ان کی علمی ترقی کا نتیجہ تھی۔ اس زمانہ میں مسلمان نہ صرف عقلی علوم میں یگانہ و یکتا تھے بلکہ دینی علوم کے امام بھی وہی تھے۔

آج یورپی قوموں کو جو عروج وعزت حاصل ہے، اس کی بنیاد بھی علم ہی پر ہے اور حیرت انگیز بات یہ ہے کہ یورپ نے یہ علوم ان عرب مسلمانوں سے حاصل کیے جو آج یورپ کے مقابلہ میں پس ماندہ ہیں۔ جیسا کہ علامہ اقبال فرماتے ہیں:

> ''مسلمانوں کا علمی ورثہ بڑا عظیم اور قابل فخر ہے۔ علم وحکمت کی کوئی شاخ نہیں ہے جس پر ان کی ذہانت اور اجتہاد کا نقش ثبت نہ ہو، یہ مسلمان ہی تھے جنہوں نے صحیح معنوں میں علمی روح پیدا کی اور علوم وفنون کو ان کے اصل راستے

آنچار (صورہ)، سری نگر، کشمیر ۱۹۰۰۱۱۔

راستے پر ڈال دیا۔ علم کا وجود جسے آج کل سائنس کہتے ہیں انہی کا مرہون منت ہے۔ یہ اسلام ہی تھا جس نے وہ شرائط بہم پہنچائیں جن پر علم کی ترقی اور نشوونما کا دارومدار ہے۔ یہ شرائط کیا تھیں؟ مشاہدہ، معاینہ، فکر ونظر اور غیر مرئی کا احترام، تجربہ و تحقیق، تفتیش، حقائق کا اثبات، ان کا مطالعہ اور ان کی تاویل و تعبیر، یہ شرائط یوں نہ ہوتیں تو علم کا راستہ دیر تک رکا رہتا''۔ (اقبال کے حضور میں، از سید نذیر نیازی، جزء اول، کراچی، جولائی ۱۹۷۱ء)

قرونِ وسطیٰ کے مسلمان سائنس دانوں کے کارناموں پر پچھلی تقریباً نصف صدی میں گراں قدر کام ہوا اور بہت سی قابل قدر کتابیں منصۂ شہود پر آچکی ہیں اور یہ سلسلہ آج بھی برابر جاری ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں کشمیر میں بھی اگرچہ تاخیر ہی سے مگر قابل ذکر کام ہوا ہے اور جس کا سہرا خاص طور سے کشمیر کے معروف محقق، نقاد اور دانشور جناب ڈاکٹر غلام قادر لون صاحب کو جاتا ہے۔ مسلمان سائنس دانوں کے عظیم کارناموں پر ان کی شاہکار تصنیف ''قرون وسطیٰ کے مسلمانوں کے سائنسی کارنامے'' ہے۔ جس کا دوسرا ایڈیشن حال ہی میں مرکزی مکتبہ اسلامی نئی دہلی (۲۰۱۴ء) سے شائع ہوا ہے۔ پاکستان میں بھی اس کے کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں اور اس پر ۸۰ سے زیادہ ہندو پاک کے مختلف اخبارات و رسائل میں اہل دانش کی طرف سے گراں قدر تبصرے بھی شائع ہو چکے ہیں۔ یہ کتاب اصل میں مسلمان سائنس دانوں کے سائنسی کارناموں پر ایک تحقیقی جائزہ اور ان کی علمی و فکری کاوشوں کا حاصل مطالعہ ہے۔ مصنف کتاب کو بھی احساس ہے کہ جدید سائنس اور ٹیکنالوجی میں مسلمان سائنس دانوں کے کارناموں کا ذکر اور ان کے نام نہ پا کر نئی نسل احساسِ کمتری کی شکار ہے۔ جیسا کہ وہ مقدمۂ کتاب میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

''مسلمان جہاں سائنس کی ایجادوں سے دوسروں کی طرح فیض اٹھا رہے ہیں وہاں ان کے ذہن میں بار بار یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جدید سائنس اور ٹیکنالوجی میں مسلمانوں کا کیا رول رہا ہے۔ اپنے عہد کے نامور سائنس دانوں کی فہرست میں کسی مسلمان کا نام نہ پا کر نئی نسل خاص طور پر احساس کمتری کا شکار رہی ہے۔ اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں زیر تعلیم مسلم طلبہ کو یہ احساس ہمیشہ

دامن گیر رہتا ہے کہ ان کے اسلاف کا دامن سائنسی کارناموں سے کیوں خالی ہے۔جس پر انہیں فخر ہوتا،غیر مسلموں کی نظروں میں مسلمان کی تصویر ایک ایسے شخص کی شبیہ ہے جو حرم کی وسعت کا دلدادہ،عیش و عشرت کا عادی،خیالی شاعری کا رسیا اور تعلیم سے محروم انسان ہے،چین سے لے کر امریکہ تک اس کی ایک ہی شبیہ ہے جس کے خدوخال یہ ہیں کہ وہ بڑا خوف ناک اور تنگ نظر وجود ہے۔ننگ کائنات ہے۔فرسودہ باتوں پر جان دیتا ہے۔اسے زمانے کے تقاضوں کا کوئی علم نہیں ہے،پرانی روایات کو سینے سے چمٹائے ہوئے ہے‘‘۔(ص ۹)

آگے چند سطور کے بعد مصنف کتاب غیر مسلموں کے ذہنوں میں اس مکروہ شبیہ کے پیدا کرنے کا ذمہ دار خود مسلمانوں کو ٹھہراتے ہوئے لکھتے ہیں:

’’غیر مسلموں کے ذہنوں میں یہ مکروہ شبیہ پیدا کرنے کا ذمہ دار خود مسلمان ہے،جس کی کاہلی اور بے علمی نے اغیار کو ہنسنے کا موقع دیا۔کسل مندی اور جہالت کی بنا پر آج اگر مسلمان کو فرش خاک پر بار گراں سمجھا جاتا ہے تو اس میں خود مسلمانوں کا بھی اتنا ہی قصور ہے جتنا اغیار کی غلط نظروں کا‘‘۔

مسلمانوں کی زبوں حالی اور پس ماندگی کا ذکر کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

’’عصر حاضر میں اخلاقی لحاظ سے مسلمانوں کی پس ماندگی کی اصلی وجہ اگر ایمان و علم سے دوری ہے تو دنیاوی لحاظ سے ان کے زوال کا اہم سبب سائنس اور ٹیکنالوجی سے بے خبری ہے،وہ زمانے کے تقاضوں سے بے خبر ہیں اور نئے علوم کی طرف توجہ نہیں دیتے۔ایسا بھی نہیں کہ وہ ذہنی صلاحیت سے محروم ہیں۔آج کے دور انحطاط میں بھی وہ علم کی جس شاخ میں بلند مرتبہ پانے کا عزم کرتے ہیں اس میں چوٹی کا مقام پاتے ہیں‘‘۔ (ص:۱۰)

مقدمہ کے بعد ایک تمہیدی نوعیت کا مضمون ’’علم کا مقام‘‘ کے عنوان سے لکھا ہے۔جس میں انہوں نے قرآن و حدیث کی روشنی میں علم کی اہمیت کو اجاگر کیا ہے اور یہ بھی واضح کیا ہے کہ اللہ کے رسولؐ کے انتقال فرمانے کے بعد صحابہ کرامؓ نے علم کو عبادت سمجھ کر اس کو حاصل کرنے کے

لیے انتھک محنت اور جدوجہد کی اور پھر اس کی اشاعت و ترویج میں بھی اہم رول ادا کیا گیا ہے۔ جیسا کہ وہ لکھتے ہیں۔

> ”رسول اللہؐ کے بعد صحابہ نے علم کو عبادت سمجھ کر اس کی ترویج و اشاعت میں دور دراز علاقوں کے سفر کیے، خلافت اسلامیہ میں صحابہ کی ایک بڑی تعداد اسلامی قلم رو کے مختلف شہروں میں فروکش ہوئی“۔(ص:۱۵)

اور مضمون کے آخر میں یہ بھی بتایا ہے کہ مسلمانوں نے علوم شرعیہ کی خدمت میں جس تن من کی بازی لگائی اسی طرح انہوں نے دنیاوی علوم میں بھی اپنی دیدہ وری کا ثبوت دیا ہے۔تحریر فرماتے ہیں:

> ”مسلمانوں نے دنیاوی علوم میں بھی اسی دیدہ وری، تحقیق و تفتیش اور ذمہ داری کا ثبوت دیا ہے جو علوم دینیہ کے لیے خاص تھی، تاریخ، جغرافیہ، حیاتیات، کیمسٹری، فزکس، طب، ہیئت اور ریاضی جیسے علوم میں مسلمانوں کے شاندار کارناموں کو پڑھ کر عقل چکرا جاتی ہے یہ صحیح ہے کہ مستشرقین نے ہمارے اسلاف کے روشن کارناموں پر ازراہ عناد صدہا دبیز پردے ڈال رکھے ہیں مگر روشنی کی جو چند کرنیں ان پردوں کو چیر کر باہر آرہی ہیں بجائے خود رشک آفتاب ہیں“۔(ص:۱۶)

اسلامی دنیا کے اہم علمی مراکز مثلاً قرطبہ، بغداد، سمرقند وغیرہ شہروں میں یورپی طلبہ جمع ہوتے تھے اور مسلمان سائنس دانوں، ماہرین فلکیات اور لسانیات کے اساتذہ سے فیض حاصل کرتے تھے۔ یہ اتنا ہی عام تھا جتنا کہ آج مسلم دنیا کے طلبہ کو یورپ اور امریکہ کی یونیورسٹیوں کی جانب رخ کرتے ہوئے دیکھا جاسکتا ہے۔عربی عموماً درسی زبان ہوا کرتی تھی اور علم، سائنس اور ثقافت کا مخزن بھی، یورپ کے طلبہ اکثر اپنے استادوں اور ہم جماعت طلبہ کے خدوخال اور وضع قطع بھی اختیار کرلیا کرتے تھے۔ یورپ کے دانش وروں نے اصفہان، شیراز، سمرقند، بخارا اور دمشق کی دانش گاہوں میں شرف تلمذ حاصل کیا، بعد میں یورپ کے دانشوروں، سائنس وٹیکنالوجی کے ماہرین، طب وحکمت کے جان کاروں نے فکر وفلسفہ کے کارناموں پر اپنا ابتدائی سفر طے کیا، غرض

یہ کہ اہل عرب کی کوششوں سے علوم وفنون کی روشنی مشرق سے مغرب تک پہنچی جس وقت یورپی ممالک کے لوگ جہالت کے تحت الثریٰ میں زندگی بسر کررہے تھے، اس وقت مسلم ممالک خاص کر اسپین میں ذہنی بالیدگی اور علمی وفکری سرگرمیاں اپنے نصف النہار پر تھیں۔ مشہور مورخ ڈنلوپ (Dinlop) کے مطابق۔

''جس زمانے میں مسیحی تعلیمی ادارے محض سادہ وآسان حساب کی مشقیں کررہے تھے اور گرجا گھروں میں گانا لکھایا جارہا تھا۔ اس وقت اسپین عربوں کے سفرا لاطینی و یونانی زبانوں کی معیاری کتابوں کی تلاش میں تھے، جن کو عربی میں منتقل کیا جاسکے۔ کونیات وفلکیات کے مطالعہ کے لیے رصدگاہیں قائم تھیں۔ معلومات میں اضافے کے لیے علمی اسفار معمول کی بات تھی اور وہاں ایسی درس گاہیں قائم تھیں جہاں ہر قسم کے علوم وفنون کی تعلیم دی جاتی تھی''۔ (مسلم اسپین، تہذیبی وثقافتی تاریخ، از ڈاکٹر محمد فاروق، ص ۱۸۷)

مسلمان سائنس دانوں اور دوسرے مختلف قسم کے علوم وفنون کے ماہرین کے انھی کارناموں کو لے کر مصنف نے گیارہ موضوعات کو ترتیب دیا ہے اور ان کے تحت سیر حاصل بحث کرتے ہوئے واضح کیا ہے کہ مسلمان سائنس دانوں اور ماہرین نے جو سائنسی کارنامے انجام دیے ہیں وہی بنیادی طور پر دورِ جدید کے خالق اور نت نئے ایجادات واکتشافات کا پیش خیمہ ثابت ہوئے ہیں۔ تاہم یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ متعصب اور جاسوس مستشرقین نے ہمارے اسلاف کے روشن کارناموں پر اپنے عناد وتعصب کی وجہ سے دبیز پردے ڈال رکھے ہیں۔ اس سلسلہ میں صاحب کتاب نے مستشرقین کی کارستانیوں اور دسیسہ کاریوں کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ کتاب میں جن گیارہ موضوعات کو چنا گیا ہے ان پر ترتیب وار چند گزارشات ومعروضات قدرے تفصیل سے پیش کیے جاتے ہیں:

۱۔ کتاب کے پہلے مضمون کا عنوان ''تاریخ نگاری'' ہے۔ چونکہ یہ بات معلوم ہے کہ فنِ تاریخ کی تدوین میں سب سے اہم رول مسلمان مورخین کا ہے۔ تاریخ کے میدان میں ان کا عظیم کارنامہ اسماء الرجال ہے۔ تاریخ نگاری کے معاملہ میں جو تحریک قرآن کے ذریعہ ملتی ہے وہ کسی

اور ذریعہ سے نہیں ملتی ہے۔قرآن میں جن پیغمبروں کا ذکر آیا ہے اور جن اقوام اور امتوں کی طرف ان کو بھیجا گیا، ان کے بارے میں قدیم تحریف شدہ آسمانی کتابوں ـ تورات، زبور اور انجیل ـ میں رطب و یابس کے ساتھ بہت سی متضاد اور من گھڑت باتیں ملتی ہیں اور بہت سے حقائق کو مسخ کر کے پیش کیا گیا ہے اور بہت سی ایسی باتوں کو بھی ان کتابوں میں شامل کیا گیا ہے جو پیغمبروں کی عظمت و عصمت کے صریحاً خلاف ہیں۔اس سلسلہ میں مصنف لکھتے ہیں:

> ''قرآن مجید میں پچھلی امتوں کا تذکرہ بار بار آیا ہے اس لیے مسلمانوں کے لیے ان قوموں کے حالات سے واقف ہونا ضروری تھا۔چنانچہ قرآنی واقعات کی تحقیق کا جذبہ ہی مسلم تاریخ نگاری کے لیے اولین محرک ثابت ہوا''۔

سیرت النبیؐ اور مغازی کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''علاوہ ازیں خود سیرت النبیؐ اور مغازی نے بھی فن تاریخ کی ترقی میں اہم رول ادا کیا، بلکہ دیکھا جائے تو مسلمانوں کی تاریخ نگاری کی ابتدا ہی سیر و مغازی سے ہوئی ہے۔اسلام میں سب سے پہلے سیرت النبی کے واقعات قلم بند کرنے کی طرف توجہ دی گئی۔اس سے سیرت نگاری کو فروغ ملا، سیرت النبیؐ میں مغازی کا تذکرہ بہ کثرت آتا ہے۔اس لیے مغازی سے دلچسپی پیدا ہوئی۔پھر یہیں سے فتوحات کی تاریخ لکھنے کا آغاز ہوا۔
>
> حدیث، تاریخ اور سیرت نگاری میں مسلمانوں کا سب سے عظیم کارنامہ فن اسماء الرجال ہے۔یہ وہ فن ہے جس میں احادیث و سنن کی صحت معلوم کرنے کے لیے راویوں کی جانچ پرکھ ہوتی ہے''۔ (ص:۱۷)

مصنف کی نظر میں:

> ''مسلمانوں نے تاریخ کے موضوع کو وقائع نگاری کے محدود دائرے سے نکال کر ایک وسیع، متنوع اور جامع تصور دیا۔انہوں نے نہ صرف بادشاہوں کے فتوحات قلم بند کیے، بلکہ شکستوں اور ہزیمتوں کی المناک داستانیں بھی تحریر کی ہیں۔انہوں نے خلفاء کی تاریخیں ہی سپرد قلم نہیں کیں بلکہ وزراء، امراء،

شرفاء، فقہاء، قراء، قضاۃ، ولاۃ، نحاۃ، محدثین، مفسرین حتی کہ مورخین کی الگ الگ اور کئی کئی تاریخیں بھی لکھی ہیں۔ مسلم مورخوں نے ان برگزیدہ انسانوں کے احوال واقوال بھی تحریری صورت میں محفوظ کر کے رکھ دیے، جن کا تعلق کائنات سے کم اور ماورائیت سے زیادہ تھا۔ نیز ان لوگوں کے افعال قبیحہ بھی حوالہ قرطاس کیے جو زمین پر بارگراں بن کر رہے ہیں''۔ (ص:۲۴)

تاریخ نگاری کے اس اہم موضوع کے تعلق سے یہ بھی لکھا گیا کہ امام ذہبی (۶۷۳ھ۔ ۷۴۸ھ) نے تاریخ کی چالیس اقسام گن کر بلاشبہ مسلمانوں کا تصورِ تاریخ واضح کیا ہے۔ اسی لیے کہا گیا ہے کہ مورخین اسلام کے لیے دنیا کی کوئی چیز اجنبی نہیں رہی ہے۔ (ص:۲۵)

کتاب کا دوسرا عنوان: ''جغرافیہ'' ہے۔ مصنف کے نزدیک تاریخ نگاری کے بعد مسلمانوں کا سب سے اہم اور عظیم کارنامہ ''علم جغرافیہ'' ہی رہا ہے۔ اس میدان میں بھی سب سے آگے وہی ہیں۔

''اسلام میں علم جغرافیہ کے فروغ میں عبادات اور معاملات دونوں نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ فریضۂ حج کی ادائیگی کے لیے راستوں سے واقفیت، نماز کے قیام اور مسجد کی تعمیر کے وقت قبلے کا تعین، امور سلطنت کی انجام دہی اور تجارتی مقاصد کے لیے مختلف بلاد وامصار کے جغرافیائی محل وقوع سے آگاہی وہ محرکات تھے جنھوں نے مسلمانوں کو جغرافیہ کا علم حاصل کرنے پر آمادہ کیا''۔ (ص:۲۷)

مصنف نے درجنوں ایسی کتابوں کا ذکر کیا ہے جو مسلمان مورخین نے علم جغرافیہ کے موضوع پر لکھی ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ قرون وسطیٰ کے مسلمانوں کا دور علم آگہی اور سائنس کے اعتبار سے کس قدر سنہرا دور تھا۔ لکھتے ہیں جغرافیہ میں مسلم سائنس دانوں کے اکتشاف وانکشاف کا عمل صدیوں تک جاری رہا، عہد وسطیٰ میں مسلمان ہی اس علم کے امین تھے۔ اس طویل زمانے کے دوران انھوں نے جغرافیہ میں جو خدمات انجام دی ہیں وہ ایک تفصیل طلب موضوع ہے اور اس کا چند صفحات میں سمیٹنا ممکن نہیں ہے۔ (ص ۳۸)

لیکن یہ بلاشبہ تاریخ انسانی کا المناک سانحہ ہے کہ جو لوگ علم جغرافیہ کے موجد اور خالق تھے اور جنھوں نے اس پر گراں قدر کام کیا تھا، آج وہی تمام علوم وفنون میں تہی دست اور غیروں کے دست نگر ہیں۔

تیسرا عنوان: ''معدنیات'' ہے۔اس عنوان سے دلچسپ معلومات پیش کی گئیں ہیں:

''زمانۂ قدیم اور عہد وسطیٰ میں فن معدنیات کوئی منظم علم نہیں تھا۔لوگ معدنیات میں اس لیے دلچسپی لیتے تھے کہ ان کے نزدیک پتھروں کے خواص سے انسانی زندگی کے واقعات متاثر ہوتے تھے۔یہ تصور دنیا کی آبادی کے ایک بڑے حصے میں آج بھی موجود ہے اور ستم ظریفی یہ ہے کہ علم کی اشاعت کے بعد بھی معدنیات کے متعلق یہ خیال جوں کا توں قائم ہے تاریخ میں جواہرات سے بادشاہوں اور امیروں کی دلچسپی کی ایک وجہ یہ بھی بیان کی جاتی رہی ہے۔چونکہ معدنیات زمین میں پائی جاتی ہیں۔اس لیے جغرافیہ سے اس کا خاص تعلق ہے''۔(ص:۶۱)

علم معدنیات سے مسلمانوں کی دلچسپی کے آغاز کی وجہ ملاحظہ ہو:

''علم معدنیات سے مسلمانوں کی دلچسپی کا آغاز اس وقت ہوا جب ارسطو کی تصنیف معدنیات کو عربی زبان میں منتقل کیا گیا۔آٹھویں صدی عیسوی کے دوران یہ دلچسپی روز بروز بڑھتی گئی۔مسلمانوں نے قیمتی جواہرات پر توجہ دے کر کتابیں لکھنے کا آغاز کیا۔یہ کتابیں حجریات کہلاتی تھیں۔حجریات یا معدنیات کے موضوع پر مسلمانوں نے پچاس سے زائد کتابیں تصنیف کی ہیں''۔(ص:۶۱)

معدنیات کے ماہرین خصوصاً البیرونی کے بارے میں لکھا کہ:

''علم معدنیات میں سب سے اہم کارنامہ البیرونی نے انجام دیا ہے۔ انہوں نے اس موضوع پر **الجماهر فی معرفة الجواهر** کے عنوان سے ایک ضخیم کتاب تصنیف کی، جس میں انہوں نے بے شمار پتھروں اور دھاتوں کے طبعی اور تجارتی پہلوؤں پر سیر حاصل بحث کی ہے''۔ (ص:۶۳)

یہی نہیں:

"معدنیات کے میدان میں مسلم سائنس دانوں نے صرف پتھروں کی تاثیر اور ان کے خواص بیان کرنے تک اپنی تحقیقات کا دائرہ محدود نہیں رکھا، بلکہ انھوں نے تجربات اور مشاہدوں کی روشنی میں پتھروں کی صنعتی اور تجارتی افادیت کے علاوہ دواؤں میں ان کی اہمیت بھی بیان کی"۔(ص:۶۴)

خام تیل، پیٹرولیم، تارکول اور کوئلے کی کانوں کے بارے میں لکھتے ہیں:

"خام تیل اور پیٹرولیم کے ذخائر باکو میں پائے جاتے تھے۔ وہاں کے چشموں کا ذکر مسعودی نے کیا ہے۔ ان کے بیان کے مطابق یہاں نفط سیاہ (خام تیل) اور نفط سفید یعنی پٹرولیم بڑی مقدار میں پایا جاتا تھا، جسے حاصل کرنے کے لیے تجارتی جہاز یہاں آیا کرتے تھے۔ خلیفہ المعتمد باللہ (المتوفی ۲۷۹ھ/ ۸۹۲ء) نے ۲۷۲ھ/ ۸۸۵ء میں تیل کے چشموں کی آمدنی دربند کے باشندوں کے لیے وقف کی تھی۔ ساتویں صدی ہجری/ تیرہویں صدی عیسوی میں یہاں تیل کے چشمے کھودے گئے۔ اس زمانے میں بیک وقت سوسو کشتیاں تیل لے کر دوسرے علاقوں میں جاتی تھیں۔ خام تیل کی پیداوار کا دوسرا اہم مرکز عراق تھا، جہاں دجلہ کے کنارے موصل پایا جاتا تھا۔ سیاہ خام تیل کو عمل تقطیر سے گزار کر سفید تیل حاصل کیا جاتا تھا۔ جس کو نفط سفید کہا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ پٹرولیم اسپرٹ بھی حاصل کی جاتی تھی۔ عراق میں تارکول بھی تیار ہوتا تھا۔ یہاں سے اسے دوسرے ملکوں کو برآمد کیا جاتا تھا۔ کوئلے کی دستیابی کے لیے فرغانہ کی کانیں مشہور تھیں"۔(ص:۷۰)

آج معدنیات کے بارے میں پڑھتے ہیں اور نت نئے اکتشافات اور انکشافات سے آگاہ ہوتے ہیں تو بہت دکھ ہوتا ہے کہ ہم خود کو اپنے اسلاف کی تحقیق و دریافت اور ان کے سائنسی کارناموں سے یکسر بے خبر پاتے ہیں۔

چوتھا عنوان: "نباتیات" کا ہے۔ اگرچہ مصنف کتاب نے حیاتیات کا عنوان نہیں دیا

ہے، تاہم نباتیات کے ضمن میں انہوں نے لکھا:

''عہد وسطیٰ کی ہزار سالہ مدت کے دوران مسلمانوں نے حیاتیات (Biology) کی سائنس میں وقیع خدمات انجام دی ہیں۔ حالانکہ اس زمانے میں یہ علم جدید خطوط پر مدون نہیں ہوا تھا، آج اس کی ایک شاخ نباتیات (Botany) کہلاتی ہے۔ مسلم ماہرین کے یہاں دوا سازی سے اس کا گہرا تعلق رہا ہے۔ ہر پودا یا جڑی بوٹی کسی نہ کسی مرض کی دوا ہے، اس لیے مسلمانوں نے نباتات کی طبعی افادیت کے پیش نظر اسے الادویۃ المفردۃ کا نام دیا ہے۔ چنانچہ الادویۃ المفردۃ کے عنوان کے ذیل میں نباتات ہی موضوع بحث ہوتے ہیں''۔ (ص:۷۵)

اسپین کے مسلمانوں نے تاریخ نباتیات میں شاندار اوراق جوڑ دیئے ہیں۔ اسلامی دنیا کے مشرقی حصے میں نباتیات کے موضوع پر بکثرت کتابیں لکھی گئی ہیں۔ مصنف نے اس موضوع پر تفصیل سے قابل ذکر کتابوں کے نام اور ان کے مصنّفین کے نام بیان کیے ہیں۔ یہ بھی لکھا کہ کتب خانوں میں نہ جانے کتنی گراں قدر کتابیں مخطوطات کی صورت میں پڑی ہوئی ہیں۔ (ص: ۸۰) اسی طرح زراعت اور باغبانی کے حوالے سے لکھا کہ:

''یونانیوں کی خیالی کائنات پر مسلمانوں نے ہمیشہ عملی دنیا کو ترجیح دی۔ انہوں نے اپنی معلومات سے کام لے کر زراعت اور باغبانی کو ترقی دی۔ کاشت کاری کے نئے طریقے رائج کیے۔ درختوں اور پودوں کی کاشت، ان کی نشوونما کی مدت کے تعین، پھلوں کو لگنے والی بیماریوں اور ان کے سدباب پر روشنی ڈالی۔ انہوں نے کھاد کے استعمال کی طرف توجہ دلانے کے ساتھ ساتھ ان فصلوں کی نشاندہی کی، جن سے زمین کی قوت زرخیزی میں اضافہ یا کمی ہوجاتی ہے۔ نباتیات اور زراعت میں اپنی بے پناہ مہارت سے مسلمانوں نے یورپ کو لہلہاتے سبزہ زاروں میں بدل دیا۔ (ص:۸۴)

مسلمانوں کے علم زراعت اور نباتیات نے یورپ کی سرزمین پر انمٹ

نقوش چھوڑے ہیں، جو اسپین اور مغرب کے زراعتی نظام میں آج بھی نمایاں ہیں۔ زراعت سے متعلق چیزوں، نباتیات اور میووں کے ان گنت نام عربی سے ماخوذ ہیں''۔(ص:۸۸)

پانچواں عنوان: ''حیوانیات'' کا ہے۔علم حیاتیات ہی کی ایک شاخ قرار دیتے ہوئے لکھا ہے:

''سائنس کی دوسری شاخوں کی طرح مسلمانوں نے حیوانیات کے شعبہ میں بھی درخشاں کارنامے انجام دیے ہیں۔جن کی تاریخ صحرائے عرب سے شروع ہوتی ہے۔حیوان شناسی میں عرب یونانیوں کے بجائے اپنے اس ماحول کے مرہون منت ہیں جس نے ان پر اونٹ، گھوڑے اور بکری کی اہمیت واضح کیا ہے۔ یہ عرب ہی تھے، انہوں نے سب سے پہلے اونٹ کو انسان سے مانوس کر کے اسے بار برداری کے لیے استعمال کیا، جو ان کی حیوان شناسی کی سب سے بڑی دلیل ہے''۔(ص:۹۱)

اس سلسلہ میں ماہرین فن خصوصاً علامہ دمیری (۱۳۴۱ء۔۱۴۰۵ء) کی شاہکار و شہرۂ آفاق تصنیف ''حیاۃ الحیوان'' کا ذکر کیا ہے۔

''یہ کتاب حیوان شناسی کے موضوع پر مسلمانوں کی سب سے اہم کتاب مانی جاتی ہے۔''حیاۃ الحیوان'' حروفِ تہجی کی ترتیب کے اعتبار سے مرتب کی گئی ہے اور اس میں نوسو اکتیس جانوروں کے نام، عادات، غذائی اہمیت، حلت وحرمت، طبی افادیت، خواص اور دوسری چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ یورپ کے مورخین حیاۃ الحیوان کے مصنف الدمیری کو عربوں کا سب سے بڑا حیوان شناس مانتے ہیں''۔(ص:۹۵)

انہوں نے یہ ثابت کیا کہ حیوانیات کے حوالے سے اہل یورپ نے مسلمان سائنس دانوں کی کتابوں سے مواد لے کر اپنے نام سے شائع کیا ہے۔

''یہ اہل یورپ کے مال مسروقہ کا ہلکا سا نمونہ ہے ورنہ جس بے دردی کے ساتھ مسلمانوں کے ورثے پر ہاتھ صاف کیا گیا ہے، وہ علم ودانش کی تاریخ کا

طویل ترین سیاہ باب ہے، قرون وسطیٰ کے سائنسی علوم کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس میں مسلمانوں نے خدمات انجام نہ دی ہوں اوران میں سے متعدد انکشافات کو اہل مغرب سے منسوب نہ کیا گیا ہو، اطمینان بخش امر یہ ہے کہ خود مغرب کے بعض نامور فضلا نے بعض سرقوں کی نشاندہی کی ہے۔ مگر دریافت شدہ سرقوں کی مقدار ''مشتے نمونہ از خروارے'' کے مصداق ہے''۔ (ص ۱۰۵)

مسئلہ ارتقاء کے موضوع پر یہ تحریر بھی قابل غور ہے کہ:

''مسلمانوں میں صدیوں پہلے ایسے نظریات پیش کرنے والے موجود رہے ہیں جن پر آج یورپ اور امریکہ نازاں ہیں اور جن سے مسلمان مرعوب دکھائی دیتے ہیں۔ مسلمانوں میں ارتقاء کے قائلین خاص طور پراس موضوع کی بنا پراس طرح معتوب بھی نہیں ہوئے جس طرح یورپ میں سائنس دانوں کو زیر عتاب لایا گیا۔ خود امریکہ جیسے ترقی یافتہ ملک میں ۱۹۲۵ء تک یہ نظریہ اس قدر نامانوس تھا کہ اسکولوں میں اس کے پڑھانے پر مقدمہ بازی شروع ہوئی۔ اس کے برعکس صدہا سال پہلے مسلم درس گاہوں میں اس کی تعلیم دی جاتی تھی''۔ (ص ۱۱۰-۱۱۱)

اگر چہ مصنف نے پہلے یہ بھی لکھا ہے کہ اس سے ان کا ارتقاء کے قائلین کی تائید کرنا مقصود نہیں ہے لیکن مغالطہ کے اندیشے سے بچنے کے لیے مدیر ماہنامہ 'زندگی نو' ڈاکٹر محمد رفعت صاحب کا ایک توضیحی نوٹ ہے جو مختصر ہونے کے باوجود اہم اور غور طلب ہے (ص: ۱۱۲)۔ حالانکہ بہتر ہوتا کہ مصنف خود اپنا نقطۂ نظر واضح کرتے۔

واضح رہے مسئلہ ارتقاء کو مغرب میں جس طرح کا فروغ اور پذیرائی حاصل ہوئی ہے اس سے یہ مسئلہ الحادی بن گیا ہے۔ مغربی مفکرین کا یہاں تک دعویٰ ہے کہ یہ ساری کائنات ایک مسلسل ارتقاء کا نتیجہ ہے اور اس ارتقاء کی آخری کڑی انسان ہے۔

صحیح بات یہ ہے کہ نظریہ ارتقاء سرے سے ثابت ہی نہیں اور یہ کسی مفروضہ کے سوا کچھ نہیں۔ مولانا شہاب الدین ندوی مرحوم (۱۹۳۱ء - ۲۰۰۲ء) نے اس مسئلہ پر ایک شاہکار کتاب ''تخلیق آدم اور نظریہ ارتقاء'' لکھی ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

''نظریہ ارتقاء ثابت نہیں ہے اور اس کے ثبوت کے بارے میں اب تک ایسی کوئی حقیقت دریافت نہیں ہوسکی ہے جس کو قانون فطرت کا نام دیا جاسکے اور اس سلسلہ میں اب تک جتنے بھی دعوے کیے گئے ہیں وہ سب بلا دلیل اور بلا ثبوت ہیں۔ جن کی حیثیت قیاسات و مفروضات سے زیادہ نہیں ہے۔ اسی بنا پر اب خود دنیائے سائنس میں یہ خیال زور پکڑتا جارہا ہے کہ نظریہ ارتقاء محض ایک قیاس و مفروضہ ہے جو سائنسی نقطہ نظر سے ثابت نہیں ہے''۔ (تخلیق آدم اور نظریہ ارتقاء، ص ۳۸، ایڈیشن ۱۹۸۷ء)

چھٹا عنوان: ''علم الکیمیاء'' ہے۔ مسلمانوں میں کیمسٹری کا آغاز بنوامیہ کے زمانے میں پہلی صدی ہجری میں ہوا تھا۔ دوسری صدی ہجری میں سب سے مشہور کیمیا داں جابر بن حیان تھے، جنھوں نے تجربات کر کے علم کیمیا کو باقاعدہ سائنس کی شکل دی اور کیمیا کے موضوع پر ایک سو کتابیں تصنیف کیں۔ (ص ۱۱۵)

مصنف کے خیال میں:

''کیمسٹری میں مسلمانوں نے جو خدمات انجام دیں، ان کا اعتراف یورپ اور امریکہ کے اہل قلم نے بھی کیا ہے''۔ (ص: ۱۲۱)

مغربی محققین کی تصانیف سے درجنوں مثالیں دے کر واضح کیا گیا ہے کہ کیمسٹری کے میدان میں مسلم سائنس دانوں کی گراں قدر خدمات کی بدولت مغربی علم الکیمیاء کے لیے راستہ ہموار ہوگیا۔ گستاولی بان کا یہ قول قابل غور ہے کہ:

''علم کیمیا میں عربوں نے جو کچھ یونانیوں سے پایا تھا، وہ بہت ہی کم تھا، وہ بڑے بڑے مرکبات، جن سے یونانی بالکل ناواقف تھے۔ مثلاً الکحل، گندھک کا تیزاب، ماء الملوک وغیرہ کو عربوں ہی نے ایجاد کیا۔ انہوں نے کیمیا کے ابتدائی عملیات عرق کشی وغیرہ کو جاری کیا۔ کیمیا کی کتابوں میں جب یہ لکھا جاتا ہے کہ اس علم کا موجد لوائی زیر ہے تو یاد رکھنا چاہیے کہ کسی قسم کے علوم، نہ کیمیا اور نہ کوئی اور علم، دفعتاً ایجاد نہیں ہوئے اور ہزار برس پہلے عربوں میں اس قسم کے علمی

کارخانے موجود تھے۔ جن سے وہ اکتشافات اور ایجادیں شائع ہوئی تھیں جن کے بغیر لوائی زیر کچھ نہ کرسکتا تھے''۔ (ص ۱۲۵)

مسلمانوں کی ان کاوشوں سے عدم توجہ کا گلہ یوں کیا ہے:

''اجمالی تاریخی جائزے سے عیاں ہوتا ہے کہ عربوں کی الکیمیا کو بحیثیت مجموعی کیمیائی تصورات کے ارتقاء میں کلیدی مقام حاصل ہے۔ لیکن یہ بات کھٹکتی ہے کہ اس کی اہمیت کے علی الرغم محققین نے افسوس ناک طور پر ابھی تک اسے نظر انداز کردیا ہے۔ سائنس کے مورخوں نے عرب کیمیا دانوں پر جو کچھ لکھا ہے، اس کا اکثر حصہ ثانوی اور فرسودہ تحریروں سے لیا گیا ہے۔ غلطیوں کے انبار نے اس کی ہیئت مزید بگاڑ دی ہے۔ عرب الکیمیا کا وسیع اور زرخیز میدان محققین کے لیے کھلا پڑا ہے۔ جس میں داخل ہونا (اور اسے سر کرنا) بہر حال آسان نہیں ہے''۔ (ص ۱۲۶)

ساتواں عنوان: ''طبیعیات'' کا ہے۔ اس کے لیے ''العلم الطبیعی'' کی اصطلاح تھی جسے اب فزکس (Physics) کے نام سے جانا جاتا ہے۔ لکھا گیا کہ:

''فزکس کے میدان میں مسلمانوں کے کارنامے غیر معروف ہیں۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ازمنہ وسطیٰ میں اس علم کے ارتقاء کے بارے میں بہت کم معلومات دستیاب ہیں۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں نے سائنس کے اس شعبے میں بھی قابل فخر علمی سرمایہ اپنے پیچھے چھوڑا ہے''۔ (ص ۱۲۹)

اس کے بعد درجنوں مسلمان سائنس دانوں کے فزکس کے حوالے سے ان کے گراں قدر کارناموں اور ان کی ایجادات وتحقیقات اور اسی بنا پر عیسائی بادشاہوں کے درباروں میں عزت واحترام کا ذکر کیا گیا:

بارود کے بارے میں یہ دلچسپ اقتباس ملاحظہ ہو:

''مسلمانوں کی دوسری اہم ایجاد بارود ہے۔ جس نے دنیا کے سیاسی نقشے کو بار بار بدل دیا ہے۔ یورپ کے دو مورخوں رینو اور فادے نے اپنی

> ابتدائی تصنیف میں بارود کی ایجاد کو اہل چین سے منسوب کیا تھا، جس سے لوگوں میں یہ غلط رائے عام ہوگئی کہ بارود اہل چین کی ایجاد ہے۔ لیکن ۱۸۵۰ء میں دونوں مورخوں نے دوسری تصنیف شائع کی جس میں انہوں نے اپنی رائے بدل دی۔ بعض نئی کتابوں کے مل جانے سے انہیں اس کا ثبوت مل گیا کہ اسے عربوں ہی نے ایجاد کیا تھا''۔ (ص ۱۶۴)

کاغذ پہلی بار چین میں ۱۰۵ء میں بنایا گیا تھا اور جو صدیوں تک چین کے حدود میں ہی رہا مگر ۷۰۷ء میں کاغذ مکہ پہنچا۔ پھر مسلمانوں نے کاغذ سازی کی صنعت کو فروغ دینے کے لیے ہر ممکن کوشش کی۔ مسلمانوں کے ذریعہ بارہویں صدی عیسوی کے بعد یورپ کاغذ سازی سے آشنا ہوا اور یہیں سے یہ صنعت سارے یورپ میں پھیل گئی۔ (تفصیل کے لیے دیکھیے ص ۱۶۶۔۱۶۷)

آٹھواں عنوان: ''فلکیات'' ہے۔ اس کو اردو زبان میں عام طور پر ''علم ہیئت'' بھی کہا جاتا ہے۔ جس میں اجرام فلکی اور زمین کی گردش و کشش وغیرہ سے بحث کی جاتی ہے۔ اس علم سے مسلمان کب آشنا ہوئے؟ دوسری صدی ہجری میں افلاک اور اجرام سماوی کے مشاہدے کا عمل جنوب مغربی ایران کے مقام جندی شاپور میں شروع ہوا (ص ۱۷۲) اسی طرح بعد میں اسپین میں مسلمانوں نے اشبیلیہ میں ایک مینار تعمیر کرایا جو مینار اور رصدگاہ دونوں کا کام دیتا تھا۔ ان رصدگاہوں میں مسلمانوں نے فلکیاتی جدولیں مرتب کیں، جنہیں ''زیج'' کا نام دیا گیا۔ (ص ۱۶۳)

مسلمانوں نے شروع میں علم ہیئت کو کن قوموں سے اخذ کیا ہے؟ اس بارے میں مصنف کتاب اس طرح روشنی ڈالتے ہیں۔

> ''علم ہیئت مسلمانوں نے جن قوموں سے اخذ کیا ہے، ان کے یہاں اس کی حیثیت زیادہ تر نظری علم کی تھی۔ یونان کے علم کا ہر طرف شہرہ تھا۔ لیکن افلاک و نجوم کا مشاہدہ کرنے کے لیے ان کے پاس چند معمولی (قسم کے) آلات تھے مسلمانوں نے سب سے پہلے آلات سازی، آلات کی تنصیب اور ان کے استعمال کی طرف توجہ دے کر ہیئت کو سائنسی بنیادوں پر کھڑا کیا''۔ (ص ۱۷۵)

مسلمان سائنس دانوں نے زمین کا صحیح محیط معلوم کرنے کی بھی کوشش کی ہے اور دلچسپ

بات یہ ہے کہ قرون وسطیٰ کے مسلمان سائنس دانوں اور آج کے تسلیم شدہ محیط میں صرف ۷۹ میل کا فرق ہے۔

فلکیات پر بے شمار کتابیں تحریر کی ہیں جن میں سے کم وبیش سو کتابیں ایسی ہیں جو علم ہیئت کی تاریخ میں گراں قدر اضافہ کی حیثیت رکھتی ہیں اور یورپ والے انہی کتابوں کی بدولت اس علم سے روشناس ہوئے (ص:۱۷۹) مسلم سائنس دانوں کی ان کتابوں سے یورپی ماہرین نے خوب استفادہ کیا ہے۔لیکن متعصب ہونے کی وجہ سے بہت کم یورپی مصنّفین نے اس کا اعتراف کیا ہے۔ اس سلسلہ میں یہ اقتباس قابل غور ہے۔

> ”یورپ کے بعض متعصب فضلاء مسلمانوں کے کارناموں کو نظر انداز کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ان کا کہنا ہے کہ مسلمانوں نے کوئی کوپرنکس اور نیوٹن پیدا نہیں کیا۔مگر وہ رابرٹ بریفالٹ کی یہ بات بھول جاتے ہیں کہ انہوں نے جو کچھ کیا اس کے بغیر کوپرنکس پیدا بھی نہیں ہوسکتے تھے۔پھر یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ کوپرنکس ہوں یا کیپلر، گلیلو ہوں یا ٹائیکو براہے، سب نے مسلمانوں کے علمی انکشافات اور ایجادات پر ہاتھ صاف کرکے اس دزد دلاور کی طرح انہیں اپنے نام سے مشہور کردیا، جو رات کا مال مسروقہ صبح کو سرعام، ”اپنا مال“ چلا چلا کر نیلام کردیتا ہے“۔(ص ۲۰۰)

چند صفحات کے بعد یہ بھی واضح کیا گیا کہ علمی سرقے کی روایت زیادہ تر یورپ میں رہی ہے۔

> ”علمی سرقے کی ناپسندیدہ روایت دنیا کی دوسری قوموں کے مقابلے میں یورپ میں زیادہ عام رہی ہے۔مسلمانوں کی فلکیات بھی ان کی دست برد سے محفوظ نہیں رہی۔مغرب کے بڑے بڑے ہیئت دانوں نے یہ کام کیا ہے۔تیرہویں صدی میں رابرٹ گروسٹیسٹی RobertGrosseteste (المتوفی ۱۲۵۳ء) جو کچھ وقت کے لیے آکسفورڈ یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی رہے تھے، نے بطلیموس کے نظام ہیئت کی تردید میں قلم اٹھایا مگر اپنی کتاب کے لیے سارا مواد البطروجی کی تصنیف سے چرایا، جو بطلیموس کی فلکیات کو رد کرنے میں پورے یورپ میں مشہور ہوئے تھے۔یہ امر ملحوظ رہے کہ رابرٹ موصوف کا شمار قرون وسطیٰ کے نامور سائنس دانوں میں ہوتا ہے۔اس

سے بھی افسوس ناک رویہ ازمنہ وسطیٰ کے ایک مشہور ریاضی داں اور ماہر ہیئت ریجیو مونٹیٹینس کا ہے۔ جنھوں نے تکوینات کے موضوع پر اپنی تصنیف کا De Triangulis کا چوتھا حصہ جابر بن افلح سے سرقہ کیا۔ ان کے اس سرقے کو کاردانو Cardano نے بے نقاب کیا ہے"۔ (ص:۲۰۳)

یورپ نے علمی سرقے اور خیانت کی بدترین روایت قائم کردی۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کی یہ روش دور جدید کے مسلم علماء واہل فکر کو دعوت دیتی ہے کہ وہ اپنے اسلاف کی تخلیقات وتحقیقات اور ان کے انکشافات وایجادات پر شب خون مارنے والوں کو بے نقاب کریں۔

۹۔نواں باب: "ریاضیات" (Mathematics) کا ہے۔علوم ریاضیہ میں مسلمانوں کا اصل کام تیسری صدی ہجری/نویں صدی عیسوی سے شروع ہوا (ص:۲۰۹) اسلامی دنیا کے اس تابناک دور میں جن ریاضی دانوں کے کارنامے سامنے آئے ہیں اس سلسلہ میں مصنف کتاب نے درجنوں کے نام دیے ہیں اور جن میں چند مشہور ریاضی دانوں کے نام یہ ہیں: ابوبکر بن محمد بن الحسن الکرجی، ابن الہیثم، البیرونی، عمر خیام، شرف الدین طوسی، ابوالحسن علی بن محمد القلصادی۔

مصنف کتاب نے یہ بھی واضح کیا ہے کہ علم ریاضیات میں بھی انھی ماہرین کا اہم رول رہا ہے، جنھوں نے فلکیات میں بھی خدمات انجام دی ہیں۔ اس زمانے میں جو ماہرین فلکیات پر دسترس رکھتے تھے وہی علم ریاضیات پر بھی عبور رکھتے تھے۔ ایک ہی شخص فلکی، حساب داں، مہندس، جغرافیہ داں، منجم اور طبیب وغیرہ ہوتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مسلم ماہرین میں اکثر حکماء کا تذکرہ مختلف علوم کے ذیل میں آتا ہے۔ علم الحساب میں بھی انہیں اشخاص کے نام آتے ہیں جن کی خدمات کا ذکر فلکیات کی بحث میں آتا ہے۔ (ص:۲۰۹)

(باقی)

حالی کے معاصرین

ڈاکٹر شاہ رشاد عثمانی

خواجہ الطاف حسین حالی (پ ۱۸۳۷ء) کے معاصرین میں اگر ایک طرف عمر میں ان سے بیس برس بڑے اس عہد کے ادیب اور دانشور سرسید احمد خان شامل ہیں تو دوسری طرف بیس برس چھوٹے مرزا ہادی حسن رسوا اور عبدالحلیم شرر کو بھی شامل کیا جا سکتا ہے۔لہٰذا معاصرین حالی میں جو نامور نثر نگار شخصیات ہمارے سامنے آتی ہیں، ان میں سرسید احمد خاں (۱۸۱۷ء)، محمد حسین آزاد (۱۸۳۲ء)، محسن الملک (۱۸۳۷ء)، منشی ذکاء اللہ (۱۸۳۶ء)، ڈپٹی نذیر احمد (۱۸۳۶ء)، چراغ علی (۱۸۴۴ء)، وقار الملک (۱۸۴۷ء)، رتن ناتھ سرشار (۱۸۴۷ء)، امداد امام اثر (۱۸۴۹ء)، منشی سجاد حسین (۱۸۵۶ء)، شبلی نعمانی (۱۸۵۷ء)، مرزا ہادی حسن رسوا (۱۸۵۸ء) اور عبدالحلیم شرر (۱۸۶۰ء) وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

اسی طرح اس عہد کے وہ شعراء جو معاصرین حالی میں شامل کیے جا سکتے ہیں۔ان کی مختصر ترین فہرست یہ ہے واجد علی شاہ اختر (۱۸۲۲ء)، جلال لکھنوی (۱۸۲۴ء)، اسماعیل میرٹھی (۱۸۲۴ء)، امیر مینائی (۱۸۲۶ء)، محسن کاکوروی (۱۸۲۷ء)، میر مہدی مجروح (۱۸۲۹ء)، عبدالحمید پریشان (۱۸۲۹ء)، داغ دہلوی (۱۸۳۱ء)، امیر اللہ تسلیم لکھنوی (۱۸۳۲ء)، سید فرزند احمد صغیر بلگرامی (۱۸۳۴ء)، سید شاہ فرزند علی صوفی منیری (۱۸۳۷ء)، اکبر دانا پوری (۱۸۴۴ء) شاد عظیم آبادی (۱۸۴۶ء)، اکبر الہ آبادی (۱۸۴۶ء)، نظم طباطبائی (۱۸۵۲ء)، فضل حق آزاد (۱۸۵۴ء)، ریاض خیر آبادی (۱۸۵۶ء) اور عبدالغفور شہباز (۱۸۵۶ء)۔

اردو کے پہلے نظریہ ساز نقاد، عظیم سوانح نگار اور اس دور کے اہم شاعر الطاف حسین حالی

صدر شعبہ اردو، انجمن ڈگری کالج، بھٹکل، کرناٹک۔

پر کسی گفتگو سے قبل مناسب یہ ہے کہ ان کے دو پیش رو بزرگوں سرسید اور محمد حسین آزاد کا تعارف پیش کر دیا جائے۔

سرسید احمد خاں ۱۷/ اکتوبر ۱۸۱۷ء کو دہلی کے ایک مذہبی خاندان میں پیدا ہوئے تھے۔ ۱۸۳۱ء میں والد کے انتقال کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت اختیار کی۔ ۱۸۴۱ء میں منصفی کا امتحان پاس کر کے فتح پور سکری میں منصف ہو گئے، اپنے بھائی کے انتقال کے بعد دہلی آ گئے، قیام دہلی کے دوران ان کی مشہور کتاب ''آثار الصنادید'' شائع ہوئی، پھر ملازمت کے سلسلہ میں بجنور آ گئے۔ ۱۸۵۷ء کے واقعات اور سارے ہندوستان میں مسلمانوں کی تباہی اور بربادی کا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا جس نے انہیں بے چین کر دیا۔ مسلمان انگریزوں کی نگاہ میں باغی تھے اسی لیے ان پر زیادہ عتاب ٹوٹا۔ سرسید اس غلط فہمی کو دور کرنا چاہتے تھے چنانچہ ۱۸۵۹ء میں ''اسباب بغاوت ہند'' لکھی۔ سرسید یہ سمجھتے تھے کہ ہندوستانیوں کی پس ماندگی کی بنیادی وجہ تعلیم کی کمی ہے۔ چنانچہ ۱۸۷۰ء میں انگلینڈ سے واپسی کے بعد علی گڑھ سے ''تہذیب الاخلاق'' کا اجراء کیا۔ ۱۸۷۶ء میں سرسید ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد مستقل طور سے علی گڑھ آ گئے اور ''محمڈن اینگلو اورینٹل کالج'' کے قیام کی مہم تیز ہو گئی۔ یہی وہ ابتداء ہے جس کی وجہ سے علی گڑھ پورے ہندوستان کے مسلمانوں کا مرکز نگاہ ہے۔

سرسید بیک وقت عوامی رابطے کا بھی خیال رکھتے تھے اور اسی دوران تصنیف و تالیف کا بھی کام انجام دیتے تھے۔ جدید نثر نگاری کا آغاز ہی سرسید سے ہوتا ہے۔ انھوں نے ہمیشہ تحریر کی سادگی اور اظہار میں بے ساختگی کو اہمیت دی۔ غالباً اس کی وجہ مقصد براری، ترغیب و تلقین اور مخلوق خدا کو بیدار کرنے کا پہلو تھا۔ اردو نثر کی یہ قدیم روایت بھی رہی ہے۔ ڈاکٹر ابن فرید نے اردو نثر کے آغاز و ارتقاء پر روشنی ڈالتے ہوئے اس پہلو سے ایک اہم بات لکھی ہے:

> ''اردو کے ابتدائی دور میں اہل فن، شعر کی غنائیت و لطافت میں کھوئے رہے اور جن کو اپنا پیغام دوسروں تک پہنچانا تھا وہ وسیع تر پیرایۂ بیان کی طرف متوجہ ہوئے۔ صوفیائے کرام اور مبلغین اسلام کے اقوال و ملفوظات ہمیں نثر ہی میں ملتے ہیں۔ انہی سے اردو نثر کی ابتداء ہوئی ہے اور نثر کی پہلی کتاب ''معراج العاشقین''

جو حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو درازؒ کے ملفوظات پر مشتمل ہے، اردو میں دعوت دین کی بھی اولین ترین کتاب ہے۔ ان ملفوظات و باقیات کی وجہ سے اردو نثر کی خاصی حوصلہ مندی ہوئی، چنانچہ اسلام کے مبادی و اساسی موضوعات مستقل تصانیف کا سلسلہ شروع ہوا اور جلد ہی قرآن حکیم کے ترجموں کی طرف توجہ ہوئی''۔ (اردو نثر میں دینی خدمات۔ ادب وداد طالب، ص ۳۴)

انیسویں صدی کی وہ نثر جسے علی گڑھ تحریک سے منسوب کیا جاتا ہے وہ نثر بھی بنیادی طور پر دین اسلام کے فروغ کے لیے ہی عالم وجود میں آئی، مثلاً خود سرسید کی تفسیر قرآن جس نے اردو نثر میں علم الکلام کے دروازے کھول دیے۔ سرسید ہی کی ایک اور معرکتہ الآراء تصنیف جس کو ضبط تحریر میں لانے کے لیے انہوں نے اپنے گھر والوں کو اپنا سارا اثاثہ فروخت کردینے کی ہدایت کی تھی تاکہ ان مغربی مفکرین و مستشرقین کو مسکت جواب دے سکیں۔ جنھوں نے مغرب میں اسلام اور پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفیؐ کے خلاف گمراہی اور کذب و افتراء کا ایک طوفان برپا کر رکھا تھا۔ اس شر کے ازالہ کے لیے جس تصنیف کو عالم وجود میں آنا تھا، اسے زیادہ سے زیادہ بلیغ بھی ہونا تھا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور ''خطبات احمدیہ'' کی نثر سرسید کی دوسری تمام تصانیف کے مقابلے میں کہیں زیادہ رواں، توانا اور اثر انگیز ثابت ہوتا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ انیسویں صدی میں اردو نثر کی معیاری اور اعلیٰ ترین کتاب ''خطبات احمدیہ'' ہی ہے، جو سرسید کو جدید اردو نثر کا پیشوا بناتی ہے۔

مولانا محمد حسین آزاد اردو نثر کو مزید ترقی دینے والوں میں اس عہد کی ایک اور اہم شخصیت تھے۔ وہ دہلی کے ایک مشہور عالم اور دینی پیشوا مولانا محمد باقر کے بیٹے تھے۔ آزاد کی ولادت کے تیسرے ہی سال مولانا محمد باقر نے اردو کا پہلا اخبار ''دہلی اردو اخبار'' کے نام سے نکالا۔ آزاد نے عربی و فارسی کی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی تھی۔ شاعری میں شیخ محمد ابراہیم ذوق کے شاگرد ہوئے۔ جدید تعلیم کے لیے انہوں نے دلی کالج میں داخلہ لیا۔ جہاں ذکاءاللہ، نذیر احمد اور پیارے لال آشوب بھی زیر تعلیم تھے۔ آزاد نے طالب علمی کے زمانے سے مضمون نگاری اور شاعری شروع کردی تھی۔ ۱۸۵۷ء کے غدر میں ان کے والد پر غداری کا الزام لگا کر انگریزوں نے انہیں گولی ماردی۔ آزاد کی زندگی بھی خطرے میں تھی، وہ گھر بار چھوڑ کر لکھنو، حیدرآباد اور لاہور گھومتے رہے۔ آزاد کی تصنیفات

میں آب حیات، نیرنگ خیال، قصص ہند، دربار اکبری، سخندان فارس اور مجموعہ نظم آزاد بہت مشہور ہیں۔ خصوصاً ان میں تذکرہ شعراء ''آبِ حیات'' بہت معروف و مقبول ہے۔ یہ اردو شاعری کی پہلی تاریخ ہے، جس میں سماجی پس منظر، معاشرتی ماحول، تاریخی ارتقاء اور ادبی شعور کا لحاظ رکھتے ہوئے شعراء کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ تحقیقی نقطۂ نظر سے اس میں خامیاں اور غلطیاں بھی ہیں، لیکن اپنے عہد میں آزاد نے تحقیق کا حق ادا کر دیا ہے۔ ''دربارِ اکبری'' شہنشاہ اکبر کے عہد کی دلچسپ تاریخ ہے، جس میں آزاد نے اس تہذیب کا خاکہ کھینچنے کی کوشش کی ہے، جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے تہذیبی میل جول سے پیدا ہوئی تھی۔ اردو میں اگرچہ تمثیلی نثر کے نمونے موجود تھے لیکن عام نہ تھے اور جو تھے ان کا تعلق زیادہ تر فارسی کے صوفیانہ ادب سے تھا۔ آزاد نے پہلی بار انگریزی کے رمزیہ مضامین کے خاکے اور ترجمے ''نیرنگ خیال'' میں پیش کیے۔ آزاد کی نثر نگاری میں جو رنگینی، روانی، جوش اور اظہار خیال کی رعنائی ملتی ہے وہ بے نظیر ہے۔ بقول پروفیسر احتشام حسین ''آزاد اردو کے عظیم مصنفوں میں ہیں، اور اس نشاۃ ثانیہ کی نمایندگی کرتے ہیں جو انیسویں صدی کے وسط میں وجود میں آیا تھا''۔

مولانا الطاف حسین حالی اردو کے پہلے نظریہ ساز نقاد، عظیم سوانح نگار، اپنے عہد کے ایک شاعر اور رفقائے سرسید میں ممتاز مقام کے حامل ہیں۔ حالی نے شاعری میں کئی جہتیں تلاش کی تھیں۔ وہ ایک غزل گو بھی ہیں۔ جدید نظم کے بھی بانی ہیں، اور مرثیہ بھی خاص انداز کا لکھا ہے۔ جدید تنقید کی پیشوائی بھی انہی کے نام سے ہے اور سوانح نگاری کے بھی اولین معمار سمجھے جاتے ہیں۔ گویا مختلف قسم کی اولیات ان کے حصے میں آئی ہیں۔ اسی لیے انہیں اردو میں ادبی نشاۃ ثانیہ کا علم بردار ٹھہرایا جاتا ہے۔

حالی کی نثر کا کینوس خاصا وسیع ہے، انہوں نے مولود شریف، تاریخ محمدی، شواہد الالہام، مجالس النساء، تذکرہ رحمانیہ اور مناظرے پر مبنی مقالے اور کتابیں بھی لکھی ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان سبھوں میں اسلامی جذبات کے ساتھ نثر نگاری کے مطالبات بھی پوری طرح موجود ہیں۔ حالی کے قلم سے نکلی ہوئی ان کی تین سوانح عمریاں ''یادگار غالب''، ''حیاتِ سعدی'' اور ''حیاتِ جاوید'' اپنی ظاہری و معنوی خوبیوں کے لحاظ سے بے نظیر ہیں۔ معاصرین حالی میں کئی لوگوں نے سوانح عمریاں لکھی ہیں مگر ان میں صرف شبلی ہی قابل ذکر سوانح نگار ہیں۔ گرچہ بعض حیثیتوں سے حالی کی

سوانح عمری کو شبلی پر فوقیت دی جاتی ہے۔

اردو کی پہلی تنقیدی کتاب ''مقدمۂ شعروشاعری'' دراصل حالی کے دیوان کا مقدمہ ہے۔ جس میں پہلی بار حالی نے ادب کا مقصد سے کیا تعلق ہے اور زندگی سے اس کا کیا رشتہ ہے جیسے امور پر تفصیلی بحث کی ہے۔حالی نے ہر جگہ اخلاقی اور مقصدی پہلو پر زور دیا ہے حالی کے یہاں افراط وتفریط نہیں ہے۔ ایک شائستگی اور توازن ہے، وہ تمام انسانی عوامل کو اخلاقی اور مشرقی شعریات کے پس منظر میں دیکھتے ہیں۔ حیرت ہوتی ہے کہ حیات سعدی کا مصنف اور میر و مصحفی کے توانا حصہ کلام سے اچھی طرح آگاہ شخص کیوں کر قوم کو یہ مشورہ دے رہا ہے کہ ؎

حالی اب آؤ پیرویٔ مغربی کریں　　بس اقتدائے مصحفی و میر ہو چکی

لیکن بہرحال یہاں حالی نے نیک نیتی کے ساتھ ''پیرویٔ مغربی'' کی تلقین کی ہے، اس لیے کہ سرسید کے زیر اثر وہ سمجھتے تھے کہ اس سے علم وادب اور ملک وملت کا بھلا ہوگا۔حالی کا وہ مفہوم ہرگز نہیں تھا جو ان کے پیرووں نے غلطی سے سمجھ لیا ہے۔حالی،شبلی سے کم مشرقی نہیں تھے،مسدس مدوجزر اسلام کے علاوہ سرسید کی تحریک پر لکھی گئی کتاب ''مقدمۂ شعروشاعری'' میں انہوں نے مغربی تصورادب کا تعارف ایک اخلاقی نقطۂ نظر سے کرایا ہے۔اس طرح اپنے اپنے انداز میں مشرق کا تحفظ سرسید، حالی اور شبلی تینوں کا مطمح نظر تھا۔

معاصرین حالی میں ڈپٹی نذیر احمد کا ذکر پہلے ہونا چاہیے تھا مگر بعض وجوہ سے ان کا ذکر شبلی کے بعد فکشن نگاروں کے ساتھ کرنا زیادہ مناسب ہے۔علامہ شبلی نعمانی مذکورہ بالا تمام مصنّفین میں سب سے کم عمر تھے، اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے۔عربی وفارسی، مذہبیات اور فلسفے وغیرہ کی تعلیم بڑے بڑے علماء سے حاصل کی تھی۔ان کے والد وکیل تھے۔شبلی نے بھی وکالت کا امتحان پاس کر کے وکالت شروع کر دی، لیکن ۱۸۸۲ء میں شبلی علی گڑھ کالج میں فارسی کے استاد ہو کر چلے آئے، یہاں ان کو سرسید، مولانا حالی، محسن الملک اور پروفیسر آرنلڈ کی صحبت میسر آئی، نتیجہ میں ان کے علم کی حدیں وسیع تر ہو گئیں۔

علامہ شبلی نعمانی کی تصنیفات میں فلسفہ، ادب، تاریخ، تنقید، سوانح، علم الکلام، مکاتیب وغیرہ سبھی موضوع پائے جاتے ہیں۔مگر جن تصنیفات سے ان کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا وہ المامون، الفاروق، الغزالی، سوانح مولانا روم، علم الکلام، شعرالعجم، موازنہ انیس ودبیر اور سیرت النبیؐ وغیرہ ہیں۔

انہوں نے تاریخی نقطۂ نظر، مذہبی خیالات اور فلسفیانہ مسائل پر جو کچھ لکھا ہے اس سے اختلاف بھی ظاہر کیا گیا ہے مگر ادبی اعتبار سے ان کی بڑی اہمیت ہے۔ پھر یہ کہ اس سے پہلے کسی نے مشرقی و مغربی علماء کے خیالات اس طرح جمع نہیں کیے تھے اور نہ ہی ان کو اسلامی فلسفے کے نقطۂ نظر سے دیکھا تھا۔ شبلی کی ادبی فتوحات پر کئی قیمتی تحقیقات اور کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن سے رجوع کیا جا سکتا ہے۔

انیسویں صدی کے نصف آخر نے بہت سے مصنفوں کو پیدا کیا، ان سب کا تفصیلی تذکرہ یہاں پیش کرنا ذرا مشکل ہے، اگرچہ ترقی ادب میں ان کے حصہ کے لحاظ سے ان کا ذکر نہ کرنا بھی نامناسب ہوگا۔ مولانا ذکاء اللہ بڑے اہل علم اور اہل قلم تھے، انہوں نے تقریباً ایک سو کتابیں لکھیں۔ محسن الملک، وقار الملک، مولوی چراغ علی اور امداد امام اثر وغیرہ نے کم کم لکھا ہے مگر جو کچھ بھی لکھا ہے وہ اعلیٰ درجہ کا ہے اور یہ سب بعض حیثیتوں سے اتنے اہم ہیں کہ اردو نثر کی تاریخ میں ان کو کبھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

اردو میں ناول نگاری کا آغاز انگریزی ادب کے زیر اثر ہوا اور فروغ اس وقت حاصل ہوا جب سماجی اور معاشرتی تغیرات و انقلابات نے اس کے لیے زمین ہموار کر دی۔ نذیر احمد کا پہلا ناول ''مرأۃ العروس'' ہے، یہ کتاب انہوں نے اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت کے مقصد سے لکھی تھی، لیکن اس میں غیر شعوری طور پر ناول کے فن کی خصوصیات بھی شامل ہو گئیں۔ ایک مخصوص مقصد کی آئینہ داری اس ناول کی تحریر کا سبب بنی۔ نذیر احمد کے نزدیک اصلاح معاشرہ اور عادات و اطوار کی درستگی کے لیے قصہ گوئی سے بڑھ کر کوئی دوسرا ذریعہ زیادہ موثر نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ نذیر احمد کا بنیادی مقصد ناول نگاری نہیں بلکہ وہ اصلاحی و اسلامی امور تھے، جن کے باعث ناقدین نے انہیں مولوی اور حافظ کہہ کر نا قابل اعتنا سمجھا، یہ ان پر سب سے بڑا ظلم ہوا، سچ تو یہ ہے کہ ان کی تحریروں کو ان کے اپنے ماحول، فضا، حالات اور ضرورت کے تناظر میں دیکھا جانا چاہیے۔

جس دور کے ادب کا ذکر ہے اس میں اردو ناول نے خاص طور سے بہت ترقی کی تھی۔ مولوی نذیر احمد کے ناولوں کا ذکر ہو چکا، مگر حقیقت میں پنڈت رتن ناتھ سرشار، مرزا ہادی رسوا، مولانا عبدالحلیم شرر نے اردو ناولوں کو انگریزی فن ناول نگاری کی نظر سے دیکھا۔ رتن ناتھ سرشار انگریزی ناول کے فن سے بڑی حد تک آشنا ہو چکے تھے اور ان ناولوں کا زبردست اثر قبول کیا تھا۔

اگر چہ زمانے کا مذاق داستانوں کے مطالعہ کے لیے ہموار تھا لیکن سیاسی حالات کی تبدیلی اور ادبی رجحانات کی تغیر پذیری کے سبب فنکار کو داستان سے ہٹ کر ناول کی طرف توجہ اس لیے بھی دینی پڑ رہی تھی کہ اس میں عصری مسائل کی جھلک کے لیے بہت گنجائش تھی۔سرشار کی ناول نگاری بھی تشکیلی دور کی ناول نگاری ہی بن سکی جس کو بآسانی داستان سے الگ اور ناول کی اولین شکل قرار دے سکتے ہیں۔شاید یہی وجہ ہے کہ ''فسانۂ آزاد'' مسلسل ایک سال تک ''اودھ پنچ'' میں قسط وار شائع ہوکر ادبی حلقوں سے خراج تحسین حاصل کرتا رہا۔بعد میں یہی تمام قسطیں کتابی شکل میں چار جلدوں میں ''فسانۂ آزاد'' کے نام سے شائع ہوکر زندہ جاوید بن گئیں۔علاوہ ازیں ان کے مشہور ناولوں میں سیر کہسار، جام سرشار، کامنی اور ڈان کوٹک ذاٹ کا ترجمہ ''خدائی فوج دار'' قابل ذکر ہیں۔

مرزا ہادی رسوؔا اس دور کے ایک عظیم ناول نگار ہیں۔وہ کئی زبانیں جانتے تھے۔منطق، فلسفہ، ریاضی، نجوم، موسیقی، سائنس، کیمیا، شاعری اور ناول نگاری غرض ان کے علمی وادبی متعدد پہلو ہیں۔بقول پروفیسر احتشام حسین ''رسوؔا جتنے بڑے صاحبِ فضل تھے، ویسے سینکڑوں سال میں دو ایک ہی پیدا ہوتے ہیں''۔لیکن ان کی شہرت ان کی ناول نگاری کی مرہون منت ہے،۔ان کا سب سے پہلا ناول ''افشائے راز'' منظر عام پر آیا۔لیکن ''امراؤ جان'' کو ان کے شاہکار ناول کا درجہ حاصل ہے۔اس کے علاوہ ذات شریف، شریف زادہ اور اختری بیگم بھی ان کے معاشرتی ناولوں میں شامل ہیں۔جو اسلامی جذبے کے تحت تحریر کیے گئے ہیں، ''امراؤ جان'' پہلا ادبی ناول ہے جو دوسروں کی بہ نسبت زیادہ ترقی یافتہ نظر آتا ہے۔رسوؔا کا یہ ناول ایک اسلامی ناول کی حیثیت بھی رکھتا ہے، گرچہ اس ناول میں یہ جذبہ پوری طرح کارفرما نہیں ہے، پھر بھی خانم اور امراؤ جان کی زبان سے کئی جگہ ایسی باتیں کہلوائی گئی ہیں جن کا مقصد اصلاح ہے۔پروفیسر احتشام حسین لکھتے ہیں ''اس بات پر سبھی نقاد متفق ہیں کہ حقیقت پسندی کے اعتبار سے یہ اردو کے اہم ناولوں میں سے ہے۔ایک طوائف کی تصویر کے پیچھے ہر طبقے کے لوگ کھڑے دکھائی دیتے ہیں اور وہ لکھنؤ ہمارے سامنے آجاتا ہے جو انیسویں صدی کے اواخر میں دم توڑ رہا تھا''۔

اس دور کے دوسرے اہم ناول نگار مولانا عبدالحلیم شررہوئے۔شرر کو بھی کئی زبانوں میں مہارت حاصل تھی۔انگریزی ناول کا نمونہ ادبی وفنی اعتبار سے ان کی رہنمائی کے لیے فائدہ مند

ثابت ہوا۔نذیر اور سرشار کی طرح وہ بھی ناول کے فنی اقدار اور بنیادی عناصر سے بے خبر نہیں تھے بلکہ ان قدروں کا شرر کے ناولوں میں بھر پور اظہار ہوا ہے۔

ڈاکٹر احسن فاروقی نے شرر کی تاریخی ناول نگاری کے اسباب پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ ''یورپ کی سیاحت کے دوران اسکارٹ کا تاریخی ناول ان کی نگاہوں سے گذرا، جس میں اسلامی زندگی سے متعلق عربوں کا مذاق اڑانے کی مذموم کوشش کی گئی تھی۔ اسے پڑھ کر ان کی غیرت قومی نے ان کے قلم کو جنبش دی اور یکے بعد دیگرے متعدد تاریخی اور اسلامی ناول لکھتے چلے گئے، جن میں اسلامی تعلیمات کو بنیاد بنا کر عیسائیت کو مذہبی اور اخلاقی اعتبار سے قابل نفرت ظاہر کرنے کی کوشش ملتی ہے''۔ (اردو ناول کی تنقیدی تاریخ،ص ۱۰۰)

شرر کے ناول کا پس منظر ہندوستانی معاشرہ اور ہندوستانیوں کی پستی اور ذلت کے اسباب تھے۔ انھوں نے اسلام کی گذشتہ عظمت کے پردے میں اسے خوبصورتی کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ منصور موہنا، فلورا فلورنڈا اور فردوس بریں میں فن کا یہی اسلوب سامنے آتا ہے۔ان کے علاوہ ان کے دیگر تاریخی ناول بھی اسلامی تعلیمات اور اخلاقیات کی ترجمانی کے مقصد سے تحریر کیے گئے ہیں۔ اس سلسلہ میں ملک عبدالعزیز، ورجینا، شوقین ملکہ، فتح اندلس، فلپانا، ماہ ملک، زوال بغداد، ایام عرب اور الفانسو وغیرہ کے نام بھی لیے جاسکتے ہیں۔لیکن ان تمام ناولوں میں مکمل اور مقبول ناول ''فردوس بریں'' کو قرار دیا جاسکتا ہے۔ دراصل شرر نے اپنے ناولوں کے ذریعہ ۱۸۵۷ء کے بعد کے حالات میں مضمحل اور دل برداشتہ قوم کو پست ہمتی اور مایوسی سے نکال کر اپنے شاندار ماضی کی طرف راغب کرنے کا کام کیا ہے۔شرر نے اس ملی فرض کو اپنی ناول نگاری کے ذریعہ بخوبی نبھایا۔

اس دور کے دوسرے ناول نگاروں میں مولانا راشد الخیری کا نام بھی لیا جاسکتا ہے۔جنھوں ڈپٹی نذیر احمد کی بتائی ہوئی راہ کی پیروی کو ہی مطمح نظر بنایا اور نسوانی زندگی کی اصلاح کو اپنا مقصد بنا کے بہت سی درد انگیز کہانیاں لکھیں۔فنی اعتبار سے راشد الخیری اس انفرادیت کی منزل تک نہ پہنچ سکے جو رسوآ کے قدم سے ہم آہنگ ہوچکی تھی، لیکن ان کا فن مجموعی طور پر نذیر احمد کے مقابلہ میں رفعت کا حامل ضرور ہے۔ان کے مشہور ناولوں میں حیات صالح، صبح زندگی، شام زندگی، شب زندگی، سمرنا کا چاند، یاسمین شام، عروس کربلا اور ماہ انجم خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ مختصر یہ کہ ناول نگاری

کے آغاز میں ڈپٹی نذیر احمد، رتن ناتھ سرشار، مرزا رسوا، عبدالحلیم شرر اور راشد الخیری وغیرہ وہ فکشن نگار ہیں، جنھوں نے اس فن کو اصلاحی، تعمیری اور اخلاقی و اسلامی مقاصد کے لیے ہی استعمال کیا اور پھر یہ روایت آگے بڑھی اور عصر حاضر میں انتظار حسین، قرۃ العین حیدر وغیرہ کے یہاں تاریخ اور اسلامی فلسفہ کے حوالہ سے ناول کا فن بام عروج کو پہنچ گیا۔

معاصرین حالی کی نثر نگاری کا یہ سرسری جائزہ اس بات پر شاہد ہے کہ انیسویں صدی کے اواخر میں ہونے والی تنقید نگاری ہو یا سوانح نگاری اور ناول نگاری، یہ سب اصلاحی و تعمیری مقاصد کے تحت اخلاقی اقدار اور روحانی افکار کے فروغ کے لیے کی جارہی تھیں۔ آج اکیسویں صدی کے شعر و ادب میں جو تعمیری رجحان پایا جاتا ہے وہ دراصل اسی روایت کا تسلسل ہے جو حالی و شبلی سے شروع ہوئی تھی۔ حالی و شبلی کو اس جہان فانی سے رخصت ہوئے آج ایک صدی کا عرصہ مکمل ہورہا ہے لیکن یہ عجیب شخصیات تھیں جو اپنے حیات بخش افکار و خیالات کے ذریعہ اکیسویں صدی میں بھی خیر و فلاح اور امن و اتحاد کے لیے کام کرنے والے افراد اور اداروں کے لیے سرچشمہ توانائی بنی ہوئی ہیں۔ اسی روایت کو یعنی جدید تمدن کی چمک دمک سے مرعوبیت کو ختم کرانے اور اپنی مشرقی اقدار و روایات پر اعتماد بحال کرانے کی کوشش معاصرین حالی و شبلی کے بعد علامہ اقبال، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، دارالمصنّفین اور دبستان شبلی کے جانشین مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی وغیرہ نے اپنے اپنے اسلوب و انداز سے جاری رکھیں اور صاف لفظوں میں ہندوستانیوں کو یہ پیغام سنایا ؎

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیب حاضر کی — یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے

ماخذومراجع:

۱۔ مختصر تاریخ ادب اردو، ڈاکٹر اعجاز حسین ۲۔ تاریخ ادب اردو (جلد اول)، ڈاکٹر وہاب اشرفی ۳۔ سرسید کے نامور رفقاء، ڈاکٹر سید عبداللہ ۴۔ اردو ادب کی تنقیدی تاریخ، ڈاکٹر احتشام حسین ۵۔ ادب داد طلب، ڈاکٹر ابن فرید ۶۔ تنقید مشرق، ڈاکٹر عبدالمغنی ۷۔ مشرقی شعریات اور اردو تنقیدی روایت، ڈاکٹر ابوالکلام قاسمی ۸۔ شبلی کی علمی و ادبی خدمات، ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی ۹۔ بیسویں صدی کے ادب کا جائزہ، ڈاکٹر سید عبدالباری ۱۰۔ تعمیری ادبی تحریک، ڈاکٹر احمد سجاد

رہنمائے کتب: احادیث مبارکہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی فہرست سازی میں مستشرقین کا اہم کارنامہ

جناب عبدالمتین منیری

آپ بہ آسانی سمجھ سکتے ہیں کہ ایک ہی موضوع سے متعلق روایات ایسی ایسی جگہوں میں پھیلی ہوئی ہیں، جن کے بارے میں محسوس ہوتا ہے کہ موضوع سے حدیث کی مناسبت نہیں ہے۔ اس صورت میں کسی اشاریہ کے بغیر مطلوبہ حدیث تک پہنچنا حدیث کے عام قاری کے لیے بہت ہی مشکل ہے۔ شیخ محمد رشید رضا کی آدھی عمر تلاش میں صرف ہونے کی بات اسی کی طرف نشاندہی کرتی ہے۔

(تیسر المنفعة) بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، موطا مالک اور دارمی کے ابواب کی فہرست ہے۔ بقیہ چھ کتابوں کو اس میں شامل نہیں کیا گیا ہے، کیونکہ ان اشاریوں میں ان کے صفحات کے نمبروں کی نشاندہی کی گئی ہے اور ان کتابوں کے اس زمانے میں کوئی دوسرے ایڈیشن طبع نہیں ہوئے تھے۔

یہ رہی (مفتاح کنوز السنة) کے لیے تیسیر کی افادیت۔ رہی بات (المعجم المفهرس) کی تو اس میں مفتاح کے برخلاف ابواب کے نمبروں کے بجائے ان کے مختصر نام دیے جاتے ہیں، مثلاً: خ جہاد ۱۹۱، م اضاحی ۲۰، ت صید ۱۹، ن صید ۱۷، ق ذبائح ۹، دی ۱۵، اس سے مراد ہے بخاری کا باب نمبر ۵۶، مسلم کا باب نمبر ۳۵، ابوداؤد کا باب نمبر ۱۶، ترمذی کا باب نمبر ۱۶، نسائی کا ۴۲، ابن ماجہ کا باب نمبر ۲۷، دارمی کا باب نمبر ۶۔

تیسیر میں حروف تہجی پر المعجم میں استعمال شدہ کتابوں کے رموز اور نمبر دیے گئے۔ ابواب

ڈائرکٹر بھٹکلیس ڈاٹ کام، بھٹکل، انڈیا۔

کے نمبر معلوم ہونے پر جتنی وقت کی بچت ہوتی ہے۔اس کا اندازہ تلاش کرنے والوں کو آسانی سے ہوسکتا ہے۔

(۴) مفتاح المعجم المفھرس لالفاظ الحدیث

تصنیف مامون صاغرجی۔ناشر دارالفکرالمعاصر۔دمشق۔(۳۵۸ صفحات)

اس کتاب کی اشاعت پر بیس سال گذر رہے ہیں۔یہ ۱۹۹۵ء میں پہلی مرتبہ شائع ہوئی تھی،اس کتاب کا مقصد معجم سے استفادے کو آسان بنانا ہے۔اس میں معجم میں ابواب کے لیے جو رموز استعمال ہوئے ہیں انہیں حروف تہجی پر ترتیب دیا گیا ہے۔اس کے بعد آج سے بیس سال قبل کی کتابوں کے متداول ایڈیشنوں کے جلد نمبر اور صفحات دیے گئے ہیں۔اس مفتاح کی ترتیب میں کتابوں کے مندرجہ ذیل ایڈیشن سامنے رکھے گئے ہیں۔

صحیح البخاری: دارالطباعۃ العامرہ۔مصر ۱۳۱۵ھ۔صحیح البخاری:الشعب۔مصر ۱۳۷۸ھ۔ صحیح البخاری: ڈاکٹر مصطفی دیب البغا۔دارابن کثیر۔دمشق ۱۴۰۷ھ۔۱۹۸۷ء۔فتح الباری بشرح صحیح البخاری:ابن حجر العسقلانی۔السلفیۃ زیر نگرانی محب الدین الخطیب۔ صحیح مسلم: تحقیق محمد فواد عبدالباقی۔داراحیاء التراث العربی۔سنن ابی داؤد: تحقیق محمد محی الدین عبدالحمید۔داراحیاء السنۃ النبویہ۔سنن ابی داؤد: اعداد و تعلیق عزت عبید الدعاس۔حمص ۱۳۸۸ھ۔۱۹۶۹ء۔سنن الترمذی المسمی الجامع الصحیح۔تحقیق احمد محمد شاکر،محمد فواد عبدالباقی،ابراہیم عطوہ عوض۔سنن النسائی بشرح السیوطی و حاشیۃ السندی۔الازھر ۱۹۳۰ھ۔سنن ابن ماجہ القزوینی: تحقیق محمد فواد عبدالباقی،داراحیاء التراث العربی ۱۳۹۵ھ۔۱۹۷۵ء۔سنن الدارمی عبداللہ بن عبدالرحمٰن۔تحقیق محمد احمد دہمان۔موطا مالک بن انس: تحقیق محمد فواد عبدالباقی بیروت ۱۴۰۶ھ ۱۹۸۵ء داراحیاء التراث العربی۔

کتاب اپنی جگہ مفید ہے،لیکن اس سے تیسیر کی ضرورت ختم نہیں ہوتی۔ابواب کے نمبروں کے لیے اس سے رجوع کیے بغیر چارہ نہیں۔

مفتاح کنوز السنہ اور المعجم المفھرس کے عام ہونے کے بعد کتب حدیث کے جو ایڈیشن آئے ان میں ان کتابوں کے ابواب و حدیث کے نمبروں کی مطابقت کا اہتمام کیا گیا۔

(۵) موسوعۃ کتب الحدیث الشریف۔الکتب الستۃ

باشراف ومراجعة: صالح بن عبدالعزیز محمد بن ابراہیم آل الشیخ۔ دارالسلام للنشر والتوزیع السعودیہ۔

اس مجموعہ میں کتب ستّہ کو یکجا کیا گیا ہے۔ اس میں موطا امام مالک، سنن الدارمی کو شامل نہیں کیا گیا ہے۔ اس میں ابواب اوراحادیث کے نمبروں کو مفتاح اور معجم کی ترتیب کے مطابق کیا گیا ہے، اس کی بدولت مفتاح سے استفادہ بہ نسبت آسان ہوگیا ہے۔ لیکن معجم سے استفادہ اتنا آسان نہیں ہے۔ اگر حروف تہجی پر ابواب کے نام اور صفحات نمبر دیے جاتے تو اس کا بہت فائدہ ہوسکتا تھا۔ پچیس سال قبل اس ناچیز نے بھی ایک مفتاح اور معجم سے استفادے کو آسان بنانے کے لیے ایک ہنڈ بک تیار کی تھی۔ اس وقت الکٹرونک کتابیں شروع نہیں ہوئی تھیں۔ نہ ہی کتابوں کی کثرت سے نئے نئے ایڈیشن نکلتے تھے۔ بس پرانے ایڈیشنوں کے فوٹو چھپتے تھے، ہم نے اس ہنڈ بک میں اس وقت تک مطبوعہ تقریباً سبھی متداول متون اور شروحات کے ابواب کو مفتاح اور معجم کے مطابق کرنے کی کوشش کی تھی، لیکن بعد کے ایام میں کتابوں کے ایڈیشنوں کی بہتات، کتابوں کی الکٹرونک لائبریریوں کی اشاعت کے بعد ہماری دلچسپی اس کام سے ہٹ گئی۔

مفتاح اور معجم تیار کرنے والے چونکہ اہل زبان نہیں تھے، نہ ہی ان کا نبوت محمدی پر ایمان تھا، لہٰذا ان سے کتاب کی تیاری میں غلطیاں سرزد ہونا ایک فطری بات تھی اس سلسلے میں جو تنقیدی تحقیقات سامنے آئی ہیں۔ ان کی طرف بھی کچھ اشارہ مفید معلوم ہوتا ہے۔

(۶) مما یلاحظ علی کتابی مفتاح کنوز السنة
والمعجم المفهرس لالفاظ الحدیث

تصنیف: محمد عبداللہ حیانی۔ صفحات: ۱۰۴

(۷) اضواء علی اخطاء المستشرقین
فی المعجم المفهرس لالفاظ النبوی

تصنیف: الدکتور سعد المرصفی۔ ناشر: دارالقلم۔ صفحات: ۲۱۲

مذکورہ بالا سبھی کتابیں پی ڈی ایف پر دستیاب ہیں۔ انہیں ہماری ویب سائٹ www.bhatkallys.com پر کتب خانہ میں فراہم کیا جارہا ہے۔

اخبار علمیہ

’’دنیا کی پہلی مسجد‘‘

بریڈفورڈ انگلستان کا ایک مشہور شہر ہے۔گذشتہ صدی کے پچاس ساٹھ کے عشروں میں ہندوستان و پاکستان کے بہت سے لوگ کسب معاش کے لیے انگلینڈ آئے۔خیال تھا کہ کچھ عرصہ کمانے کے بعد وہ اپنے وطن واپس ہوجائیں گے۔لیکن حالات بدلتے گئے اور واپسی کے خیال پر گرد پڑتی گئی۔چنانچہ انہوں نے بریڈفورڈ اور اس کے مضافات میں مستقل سکونت اختیار کرلی۔گذشتہ دنوں مسلم ویمن کونسل کی چیف ایگزیکیٹو نے بریڈفورڈ میں خطاب کرتے ہوئے اپنی تحریک کے مقاصد تفصیل سے بیان کیے۔لندن کے متعدد اخباروں نے حقوق نسواں سے متعلق ان کے خیالات پر توجہ دی۔بالخصوص بریڈفورڈ میں خواتین کے لیے ایسی مسجد کے قیام کو نمایاں جگہ دی گئی جس میں امامت کے فرائض بھی خاتون امام انجام دے۔رپورٹ کے مطابق مقامی کونسل ان کے عملی پہلوؤں کا جائزہ لے رہی ہے۔اگر یہ مسجد بن گئی تو خاص عورتوں کے لیے یہ دنیا کی پہلی مسجد ہوگی۔(صراط مستقیم،ستمبر ۲۰۱۵ء)

’’گلوبل ہنگر کی چشم کشا رپورٹ‘‘

’’گلوبل ہنگر انڈکس‘‘ ایک بین الاقوامی ادارہ ہے جو غربت اور خوراک کے مسائل پر سال بہ سال رپورٹ تیار کرکے دنیا کے سامنے پیش کرتا ہے۔اپنی سالانہ رپورٹ برائے ۲۰۱۵ء میں اس نے انکشاف کیا ہے کہ بھوک کے سبب ہر سال ۳۱ لاکھ بچے جاں بحق ہوجاتے ہیں۔اس رپورٹ میں اس نے ان ۱۱۲ ممالک کی فہرست تیار کی ہے جہاں عالمی و علاقائی تنازعات کے سبب جنگوں کا سلسلہ جاری ہے۔گلوبل ہنگر انڈکس نے اپنی رپورٹ کی تیاری میں انٹرنیشنل فوڈ ریسرچ پالیسی انسٹی ٹیوٹ،کنسرن ورلڈ وائیڈ اور ولتھ ہنگر ہلف نامی بین الاقوامی تنظیموں کی مدد حاصل کی ہے۔اس رپورٹ میں یہ بات بھی موجود ہے کہ ترقی پذیر ممالک میں خوراک کے مسائل ۲۷ فیصد کم ہوئے ہیں لیکن علاقائی تنازعات کے شکار ممالک میں تغذیہ و افلاس کے مسائل میں اضافہ ہوا ہے۔ان ممالک میں افریقی جمہوریہ، چاڈ اور زامبیا سرفہرست ہیں جہاں لاکھوں افراد بھوک کے سبب ہلاک اور کروڑوں منتظر موت ہیں۔بھوک سے متاثرہ ممالک میں یمن، مشرقی تیمور، سیرالیون، ہیٹی، مڈغاسکر، افغانستان اور نائیجریا ہیں۔شام، سوڈان اور کانگو میں شدید

خانہ جنگی کے سبب تصویر صاف نہیں ہے۔بھوک سے متاثرہ ممالک میں پاکستان ۱۱ویں، بنگلہ دیش ۵۷ویں اور ہندوستان ۲۵ویں نمبر پر ہے۔اس فہرست میں یوکرین، برازیل، آذربائیجان،لٹویا، پیرو،منگولیا، بوسنیا اور ونیز ویلا بھی جلد ہی شامل ہوسکتے ہیں۔ رپورٹ میں عالمی افلاس کی اہم وجہ ماحولیاتی تبدیلیوں کے ساتھ عالمی تنازعات اورجنگوں کو بھی بتایا گیا ہے۔(تفصیلی رپورٹ منصف حیدرآباد ۱۶/ اکتوبر میں دیکھی جاسکتی ہے)

”خواتین قیدیوں کے متعلق ایک عالمی جائزہ“

”ورلڈ پریژن بریف“ نے ایک منصوبے کے تحت جیلوں کا ایک بین الاقوامی جائزہ لیا ہے۔ جس کا مقصد جیلوں میں انسانی حقوق کا پاس ولحاظ کرنے کے لیے ہدایات جاری کرنا تھا۔یہ رپورٹ ۲۱۹ ممالک کی جیلوں میں خواتین قیدیوں کی حالت زار کے متعلق معلومات پر محیط ہے۔رپورٹ میں بی بی سی کے حوالہ سے لکھا گیا ہے کہ سات لاکھ سے زیادہ لڑکیاں اورخواتین دنیا کی جیلوں میں بند ہیں۔ ۲۰۰۰ء سے خواتین قیدیوں کی تعداد میں ۵۰ فیصد اضافہ ہوا ہے اوراس اضافہ نے مردوں کی تعداد کو بھی پیچھے چھوڑ دیا ہے۔محبوس خواتین کی تعداد کا نصف حصہ خوش حال وفارغ البال اورنام نہادترقی یافتہ ممالک امریکہ، چین اورروس کی مقید عورتوں پر مشتمل ہے۔بعض ممالک نے توخواتین قیدیوں کی تعداد کے افشا سے انکارکیا ہے۔دلچسپ اورقابل ذکر بات یہ ہے کہ پس ماندہ ممالک میں خواتین قیدیوں کا تناسب ترقی یافتہ ممالک سے کم ہے۔ برازیل،کمبوڈیا اورانڈونیشیا میں خواتین قیدیوں کی تعداد میں تیزی سے اضافہ ہورہا ہے۔ خاتون قیدیوں کا تناسب عموماً کل قیدیوں میں ۲ سے ۹ فیصد ہوتا ہے لیکن ایشیا میں یہ تناسب سب سے زیادہ ۶ فیصد ہے۔وطن عزیز ہندوستان کے متعلق اس رپورٹ میں تحریر کیا گیا ہے کہ یہاں محبوس خواتین کی کل تعداد ۱۸۱۸۸ ہے اور ۲ فیصد سے بھی کم قید خانے عورتوں کے لیے خاص ہیں۔ ۱۳۹۴ ہندوستانی جیلوں میں صرف ۲۰ خواتین کے لیے مختص ہیں۔قیدی خواتین کی عمریں ۱۸ سے ۵۰ کے درمیان ہیں۔جن کی اکثریت تامل ناڈو اور کیرالا سے تعلق رکھتی ہے۔اس کے بعد راجستھان اور مغربی بنگال کا نمبر ہے۔ ۴۵۷۵ سزا یافتہ ہیں، زیر نظر مقدمات والی ۱۱۰۰۰ اورتقریباً ۱۶۳۶ ایسی خواتین ہندوستانی جیلوں میں ہیں جن کا تعلق بیرونی ممالک سے ہے۔(تفصیل سہ روزہ دعوت ۱۹/ اکتوبر ۲۰۱۵ء میں ملاحظہ فرمائیں)

''دنیا کا سب سے تیز رفتار ذریعہ حمل ونقل''

''ہائپر لوپ ٹکنالوجی'' ایک ایسا تصوراتی منصوبہ ہے جس کی کامیابی کے بعد سفر انتہائی سرعت اور تیز رفتاری کے ساتھ طے ہوگا اور نقل وحمل یعنی ٹرانسپورٹ میں آج جو وقت صرف ہوتا ہے اس میں بڑی کمی ہوجائے گی۔ اس کا تصور امریکہ کے ایلون مسک نے دو برس پہلے پیش کیا تھا۔ انٹرنیٹ کمپنی ''پے پال''، ''ٹسلا موٹرز اور خلائی ٹکنالوجی ''اسپیس ایکس'' کی بنیاد بھی ان ہی کے نام منسوب ہے۔ پہلی الکٹرک کار کی ایجاد بھی ان ہی کے ذہنی اختراع کا نمونہ ہے۔ رپورٹ کے مطابق اس ٹکنالوجی سے تیار کردہ مواصلاتی نظام کی رفتار کم از کم ۱۲ سو کیلومیٹر فی گھنٹہ ہوگی اور لاس اینجلس اور سان فرانسسکو کے درمیان ساڑھے چھ سو کیلومیٹر کا فاصلہ محض آدھ گھنٹہ میں طے ہوگا۔ اس ٹکنالوجی سے چلنے والا ٹرانسپورٹ سسٹم بلٹ ٹرین کے مشابہ ہوگا۔ مسافروں کے بیٹھنے کے لیے کیپسول بنائے جائیں گے جو پائپ نما پٹری پر گولی کی رفتار سے تیز گام ہوں گے۔ ہر کیپسول میں ۲۰ مسافروں کے بیٹھنے کی گنجائش ہوگی۔ ماہرین کے مطابق کیپسولوں کے آپس میں تصادم کے امکانات نہ کے برابر ہوں گے۔ ٹیوب کو زمین سے کئی فٹ بلند رکھا جائے گا۔ اس منصوبہ پر ۱۰۰ ملین ڈالر کے صرفہ کا اندازہ کیا گیا ہے۔ جس میں ناسا، ایئربس، یاہو اور بوئنگ کے دوسو انجینئر کی خدمات حاصل کی جارہی ہیں۔ کیلی فورنیا کے دو درجن طلبہ اس منصوبہ کا حصہ ہیں۔ ابتدا میں ۷ فٹ چوڑے کیپسول تیار کیے جارہے ہیں۔ جن کی رفتار فی گھنٹہ ۱۲ سو بیس کیلومیٹر ہے۔ (تفصیل منصف حیدرآباد ۱۵/اکتوبر ۲۰۱۵ء میں دیکھی جاسکتی ہے)

''کنگ کانگ''

اس نام سے چین کے شہر چینگدو میں اسی ماہ کے اواخر میں کوڑے دان نصب کیے جائیں گے۔ ان کوڑے دانوں کے اوپری حصہ میں دوشمسی توانائی کے پینلز بھی نصب ہوں گے جس سے بننے والی بجلی کوڑے دان کے نیچے لگائی گئی بیٹریوں میں محفوظ ہوگی۔ اس میں نصب جی پی ایس صفائی ملازمین کو مطلع کرے گا کہ کوڑا اٹھانے کا وقت ہو چکا ہے۔ یہ آگ اور بم پروف ہوگا۔ اس کی سب سے خاص بات یہ ہے کہ اس سے بلا معاوضہ انٹرنیٹ تک رسائی ہوگی اور جیسے ہی کوئی شخص اس کے قریب جائے گا۔ یہ خود بخود کھل جائیں گے۔ اس کے علاوہ اس کے اندر بدبو ختم کرنے کا خودساختہ نظام بھی موجود ہوگا۔ (بی بی سی اردو ڈاٹ کام، ۱۶/اکتوبر ۲۰۱۵ء)

ک، ص اصلاحی

معارف کی ڈاک

قوم نوائط اور تاریخ طبری

ریاض، سعودی عرب

یکم محرم الحرام ۱۴۳۷ھ

محترمی، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

اکتوبر کے تازہ شمارے میں جنوبی ہند کے ایک بزرگ پر ڈاکٹر راہی فدائی کا مضمون شائع ہوا ہے۔ تمہید میں قوم نوائط کے بارے میں تاریخ طبری کا ایک اقتباس نقل کیا گیا ہے جس کا مفہوم مضمون نگار کے الفاظ میں یہ ہے کہ ''قوم نائط قریش کا ایک قبیلہ ہے جو پچاس ہزار علما اور اولیا کے قاتل حجاج بن یوسف کے خوف سے ۱۵۲ھ میں بحر ہند کے ساحل پر اتر کر اطراف واکناف کے علاقوں میں قیام پذیر ہوگیا''۔

اصل عربی عبارت کا ماخذ نواب قادر عظیم خاں بہادر مدراسی کی کتاب ''گلستان نسب'' (مرقومہ ۱۲۳۰ھ) ہے۔ یہیں سے تاریخ النوائط کے مصنف نے اسے نقل کیا اور تاریخ النوائط کے حوالے سے فاضل مضمون نگار نے۔ تاریخ طبری نہ مضمون نگار نے دیکھی اور نہ تاریخ النوائط کے مصنف نے۔ معلوم نہیں گلستان نسب کے مصنف نے کسی ماخذ کا حوالہ دیا ہے یا نہیں مگر یہ بات قطعی ہے کہ تاریخ طبری انہوں نے بھی نہیں دیکھی، کیونکہ اس طرح کی کوئی عبارت تاریخ طبری میں موجود نہیں ہے۔ یہی نہیں کہ اس کی زبان امام طبری کی زبان نہیں، بلکہ اس میں ایک تاریخی استحالہ بھی ہے۔ حجاج بن یوسف ۹۵ھ میں انتقال کر چکا تھا۔ انتقال کے ۵۷ سال بعد ۱۵۲ھ (واضح رہے کہ یہ سنہ عبارت میں درج ہے) میں اس کا خوف ہجرت کا باعث کیوں کر ہوسکتا ہے!

اسی مضمون کی ایک عبارت سبحۃ المرجان (مولفہ ۱۱۷۷ھ) میں بھی نقل ہوئی ہے (ط بمبئ ۱۳۰۳ھ، ص ۳۹۔۴۰) اصل عبارت فارسی میں تھی اور غلام علی آزاد بلگرامی نے عربی میں اس کا ترجمہ

کیا ہے۔دونوں عبارتوں میں فرق یہ ہے کہ گلستان نسب میں ''نائط'' کا لفظ آیا ہے اور یہاں ''نائتہ'' کا لفظ۔ ۱۵۲ھ کا یہاں کوئی ذکر نہیں۔ جس شہر سے نوائط نکلے سبحۃ المرجان میں صاف صاف اس کا نام مدینہ منورہ لکھا ہے جب کہ گلستان نسب میں ''البلدة المباركة الطيبة'' ہے۔افسوس کہ آزاد بلگرامی نے اس فارسی کتاب کا نام نہیں لکھا جو ان کے پیش نظر تھی کہ امام طبری کی جانب اس مضمون یا عبارت کے انتساب کی تاریخ متعین کرنے میں مدد ملتی۔

نواب صدیق حسن خاں نے ابجد العلوم (ط دار ابن حزم بیروت ص ۶۹۵) میں مخدوم مہائمی کے حالات لکھے تو سبحۃ المرجان ان کے سامنے تھی مگر طبری والی عبارت انہوں نے نظر انداز کر دی۔ میر عبدالحئی خاں سے رہا نہ گیا اور اسے طبری کے نام سے بغیر کسی حوالے کے حاشیے میں ٹانک دیا!

صاحب نزہۃ الخواطر (ط دار عرفات رائے بریلی ۳: ۸۰۔۸۱) نے بھی مخدوم مہائمی کے تذکرے میں یہ روایت نقل کی ہے مگر ''قیل'' کے صیغۂ مجہول سے۔ نہ امام طبری کا نام لیا اور نہ ۱۵۲ھ کا ذکر کیا، حالانکہ تاریخ النوائط ان کے مآخذ میں شامل ہے اور کئی جگہ انہوں نے اس سے استفادہ بھی کیا ہے۔اس سے مولانا عبدالحئی صاحب کی احتیاط اور مورخانہ بصیرت کا اندازہ ہوتا ہے۔

الغرض امام طبری کی جانب اس روایت کا انتساب لفظاً یا معنیً کسی صورت میں درست نہیں۔ تاریخ طبری ہی نہیں بعد کی مشہور کتب تاریخ مثلاً ابن اثیر کی الکامل، تاریخ ابن خلدون اور البدایۃ والنہایۃ بھی نوائت یا نوائط کے ذکر سے خالی ہیں۔

والسلام

(ڈاکٹر) محمد اجمل اصلاحی

انگریزی لفظ ''نیوی''

مدینہ منورہ

۲۰/ اکتوبر ۲۰۱۵ء

مکرمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

معارف کے اکتوبر ۲۰۱۵ء کے شمارے میں ڈاکٹر راہی فدائی کا مضمون ''جنوبی ہند کے

ایک گمنام مصلح و داعی حضرت علامہ فخر الدین مہکری نائطی بے خود ویلوری'' شائع ہوا ہے۔اس میں فاضل مضمون نگار نے لفظ نوائط کی اصل پر بحث کرتے ہوئے تاریخ نوائط ص ۱۱ کے حوالے سے مولانا سید سلیمان ندوی کا قول نقل کیا ہے۔سید صاحب کے قول کا خلاصہ یہ ہے کہ انگریزی لفظ ''نیوی'' نوایت سے لیا گیا ہے کیونکہ اس خاندان کے افراد فن جہاز رانی کے ماہر تھے اور پرتگیزیوں سے قبل سمندری تجارت کی باگ ان کے ہاتھ میں تھی۔

سید صاحب کا یہ قول محل نظر ہے۔انگریزی لفظ navy دراصل لاطینی ہے، لاطینی زبان میں اس کی اصل navis بہ معنی جہاز ہے۔اس لفظ کے بہت سارے مشتقات انگریزی میں مستعمل ہیں جیسے: naval (جہازرانی سے متعلق)، navigate (جہاز چلانا)، navigation (جہازرانی) navigable (جہازرانی کے قابل)۔

یہ لاطینی کا قدیم لفظ ہے، اور اس کے بارے میں یہ کہنا کہ یہ نوایت سے ماخوذ ہے کسی بھی صورت میں درست نہیں۔سید صاحب کے علمی تبحر کا انکار کسے ہوسکتا ہے، لیکن انسان سے غلطی کے امکان کی نفی بھی نہیں کی جاسکتی۔

والسلام

(ڈاکٹر) ف،عبدالرحیم

علامہ محمد فخر الدین مہکری نائطی

۱۳/۱۰/۲۰۱۵ء

بھٹکل

مکرمی مدیر معارف اعظم گڑھ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امید کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا۔معارف شمارہ اکتوبر نظر نواز ہوا۔اس میں ڈاکٹر راہی فدائی کے مضمون (جنوبی ہند کے ایک گمنام مصلح وداعی حضرت علامہ محمد فخر الدین مہکری نائطی بے خود ویلوری) نے خصوصیت سے اپنی جانب متوجہ کیا۔محترم راہی فدائی صاحب نے گذشتہ دنوں جنوب

کے کئی ایک اہل علم جن کی شخصیتیں شمال والوں کے لیے مجہول کی حیثیت رکھتی تھی، ان کی زندگیوں کو اجاگر کیا ہے۔ ان کی زنبیل میں اور بھی نام ہوں گے جنھیں تاریخ کے گرد وغبار سے نکالنا ہے۔ جنوبی ہند میں اسلام کے برصغیر میں اولین داخلے سے لے کر اب تک عظیم دینی وعلمی شخصیات گذری ہیں، ان میں سے کئی ایک جلالت شان وعظمت علمی میں بہت ہی بلند مرتبہ ومقام رکھتی ہیں، لیکن ان کے تذکروں اور سوانح سے مسلسل بے اعتنائی برتی گئی ہے۔ مثال میں مہائم ممبئی میں آسودہ خاک مخدوم فقیہ علاء الدین مہائمی نائطی ہی کو لیجیے۔ مولانا عبدالحئیؒ حسنی اپنے سفرنامہ گجرات "یاد ایام" میں ان کے بارے میں رقم طراز ہیں کہ:

> "شیخ علاء الدین علی بن احمد المہائمی گجرات کے سرمایہ ناز، اور میرے نزدیک ہندوستان کے ہزار سالہ دور میں شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے سوا حقائق نگاری میں ان کا کوئی نظیر نہیں۔ مگر ان کی نسبت یہ معلوم نہیں کہ وہ کس کے شاگرد تھے، کس کے مرید تھے اور مراحل زندگی انھوں نے کیوں کر طے کیے تھے، جو تصنیفات ان کی پیش نظر ہیں۔ ان کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ ایسا شخص جس کو ابن عربی ثانی کہنا زیبا ہے وہ کس مپرسی کی حالت میں ہے، کہیں اور ان کا وجود ہوا ہوتا تو ان کی سیرت پر کتنی کتابیں لکھی جا چکی ہوتیں اور کس پر فخر لہجہ میں مورخین ان کی داستانوں کو دہراتے"۔

اس شمارے میں کتب حدیث کی فہرستوں پر جو مضمون شائع ہوا ہے اس میں کنز العمال کے مصنف کا نام ہیثمی چھپا ہے، اس کے مصنف شیخ علاء الدین علی المتقیؒ ہیں۔

علاوہ ازیں مضمون کا آخری حصہ چھپنے سے رہ گیا ہے۔ مراسلہ کے بعد یہ مندرج ہے۔

شکریہ

(جناب) عبدالمتین منیری

شاہ شبیر عطا مرحوم

بھیونڈی

۳؍نومبر ۲۰۱۵ء

مکرمی جناب اڈیٹر صاحب ماہنامہ ''معارف''

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

ستمبر ۲۰۱۵ء کے ''معارف'' میں شاہ شبیر عطا مرحوم اوران کے خاندان کے تعلق سے میرا ایک مراسلہ شائع ہوا تھا۔اس کی تعقیب میں اکتوبر کے شمارے میں محترم ریاض الرحمٰن خاں شروانی اورشاہ ظفر الیقین صاحبان کے مراسلے شائع ہوئے ہیں۔ناچیز کوکسی غلطی پر اصرار نہیں ہے لیکن چند نکات پر میں اپنی معروضات ضرور پیش کرنا پسند کروں گا۔

''ترجمان القرآن'' پر اعتراض کی بات شاہ حسن عطا مرحوم نے خود بتائی تھی۔اس وقت سید طفیل احمد مدنی مرحوم (سابق صدر شعبہ عربی وفارسی الہ آباد یونیورسٹی) بھی وہاں موجود تھے۔اب اس بات کی تصدیق نہیں ہوسکتی۔ممکن ہے عطا صاحب مرحوم نے بطور تفخیم کچھ مبالغہ سے کام لیا ہو یا پھر میرے سمجھنے میں کچھ غلطی ہوگئی ہو۔

میں نے جس کتاب کے حوالے سے اس پر شہادت مہیا کی تھی،جناب ندیم صدیقی صاحب نے تلاش کر کے وہ کتاب میرے حوالے کردی ہے۔میں اس کتاب سے شاہ حسن عطا مرحوم والا باب منعکس کر کے آپ کے پاس اورجناب شروانی صاحب کے پاس بذریعہ ڈاک ارسال کررہا ہوں۔

شاہ ظفر الیقین صاحب نے عطا خاندان کے بزرگوں کی عمر کے تفاوت کے بارے میں جوفرمایا ہے وہ درست ہوسکتا ہے لیکن اس سے یہ عقدہ لاینحل رہ جاتا ہے کہ عدالت نے آخر شاہ نعیم عطا مرحوم کو معزول کر کے شاہ شبیر عطا مرحوم کی تولیت کو کیوں جائز قرار دیا؟

والسلام

(ڈاکٹر) محمود حسن الہ آبادی

آثار علمیہ و تاریخیہ

علامہ شبلی کا ایک نایاب عربی قصیدہ

اشتیاق احمد ظلی

سر سید نے ۱۸۹۱ء میں کالج کے چندہ کے لیے ایک مقتدر وفد کے ساتھ حیدر آباد کا سفر کیا تھا۔اس سفر کی غیر معمولی اہمیت کے پیش نظر اس میں ان کے اہم اور معتمد رفقاء شامل تھے۔اس دورہ کی اہمیت کا کسی قدر اندازہ اس سلسلہ میں گزٹ میں چھپنے والی خبر سے لگایا جاسکتا ہے جس میں اسے کالج کی تاریخ میں ''ایک نہایت اہم واقعہ'' سے تعبیر کیا گیا اور اس وفد کو''ایک بارعب اور کامل ڈیپوٹیشن'' کہا گیا ہے۔اس وفد کے ارکان میں علامہ شبلی شامل تھے۔'' کالج کی خبریں'' کے عنوان سے یکم ستمبر ۱۸۹۱ء کے انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں درج ذیل خبر چھپی:

> ''چونکہ آج کل کالج بند ہے اس لیے اس مد میں کوئی خبر درج کرنے کے لائق نہیں ہے لیکن اس انسٹی ٹیوشن کی تواریخ میں ایک نہایت اہم واقعہ وہ دورہ ہے جو آنریبل سرسید احمد خاں بہادر ایک بارعب اور کامل ڈیپوٹیشن کے ساتھ فرما رہے ہیں۔
>
> اس ڈیپوٹیشن میں جو بھوپال اور حیدرآباد جاوے گا بزرگان مندرجہ ذیل شامل ہیں:
>
> ۱۔قاضی سید رضا حسین صاحب، رئیس پٹنہ۔ ۲۔مولوی الطاف حسین صاحب حالی۔
>
> ۳۔حاجی محمد اسماعیل خاں، رئیس دتاولی۔ ۴۔مولوی زین العابدین خاں صاحب۔
>
> ۵۔شمس العلماء خان بہادر منشی محمد ذکاء اللہ صاحب۔ ۶۔مولوی محمد شبلی صاحب۔
>
> سید احمد علی، زین الدین اور مصطفیٰ خاں بھی ہمراہ ہیں''۔(۱)

سرسید کے ساتھ علامہ شبلی کا یہ پہلا سفر نہیں تھا۔مئی ۱۸۸۷ء میں وہ سرسید کے ساتھ نینی تال کا سفر کر چکے تھے(۲)۔لیکن حیدر آباد کے سفر کی نوعیت دوسری تھی۔یہ سفر فرماں روائے دکن نظام حیدرآباد اور ان کے امرائے کبار سے ملاقات اور ان سے کالج کے لیے زیادہ سے زیادہ تعاون

حاصل کرنے کے مقصد سے کیا گیا تھا اس لیے اسے بڑی اہمیت حاصل تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں سرسید کے پرانے اور اہم رفقاء کو شامل کیا گیا تھا جس کا اندازہ اس کے شرکاء کے اسمائے گرامی سے لگایا جاسکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس وفد میں ان لوگوں کو شامل کیا گیا تھا جن کے ذریعہ وہ مقصد بہتر طور پر حاصل کیا جاسکے جس کے لیے یہ سفر کیا جارہا تھا۔ اس پس منظر میں یہ بات بہت اہمیت کی حامل ہے کہ سرسید نے اس وفد میں علامہ شبلی کو شامل کرنے کا فیصلہ کیا۔ یاد رہے کہ علامہ شبلی کالج کی انتظامیہ یا تحریک علی گڑھ کے پرانے رہنماؤں میں شامل نہیں تھے جن کا سرسید سے رفاقت کا پرانا تعلق تھا بلکہ وہ کالج میں استاد تھے۔ مولانا عبدالحلیم شرر کے بقول مولانا کی اس سفر میں شمولیت سے یہ خیال لوگوں میں پھیل گیا کہ وہ ''سرسید کے گروہ کے ایک نامور بزرگ اور ان کی فوج کے ایک نامی پہلوان ہیں''۔ (۳) اس 'بزرگ' کی عمر اس وقت ۳۴ سال تھی۔ علامہ شبلی کی علمی صلاحیت اور لیاقت پر سرسید کو جو اعتماد تھا اس کا کسی قدر اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے۔ اس انتخاب کی شاید ایک وجہ یہ بھی رہی ہو کہ حیدرآباد میں امراء کے حلقہ میں علامہ شبلی کا نام ان کی تصنیفات کی وجہ سے جانا پہچانا تھا۔ کالج میں سرآسمان جاہ کی آمد کے موقع پر ان کا استقبال علامہ شبلی کے قصیدہ سے کیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ ان کی دو تصنیفات ''مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم'' اور ''المامون'' جو اس وقت تک چھپ چکی تھیں سرسید نے کالج کی طرف سے ان کو نذر کی تھیں (۴)۔ یہ دونوں تصنیفات سرسید کی طرف سے عمادالملک سید حسین بلگرامی کی خدمت میں بھی ارسال کی گئی تھیں۔ انہیں دیکھنے کے بعد انہوں نے ''المامون'' کے پچاس نسخے منگوائے (۵)۔ اس طرح حیدرآباد کے اعلیٰ حلقوں میں علامہ شبلی کے نام اور کام کا تعارف ہو چکا تھا۔

یہ سفر بہت کامیاب رہا۔ حیدرآباد میں اس کے تعلق سے متعدد جلسوں اور مجلسوں کا انعقاد ہوا۔ نواب وقارالامراء کی صدارت میں بشیر باغ میں ایک عظیم الشان جلسہ منعقد ہوا۔ اس جلسہ میں سرسید اور ان کے بعض رفقاء کی تقریروں کے علاوہ مولانا حالی نے اردو اور علامہ شبلی نے فارسی قصیدہ پیش کیا (۶)۔ یہ قصیدہ کلیات شبلی (فارسی) میں شامل ہے (۷)۔

اس سفر میں پہلی بار علامہ شبلی کی سید علی بلگرامی اور عمادالملک سید حسین بلگرامی سے ملاقات ہوئی اور ان کے درمیان نہایت مخلصانہ تعلقات قائم ہوئے جو عمر بھر استوار رہے۔ جب دارالمصنّفین

کی تاسیس ہوئی تو عمادالملک اس کی مجلس منتظمہ کے صدر منتخب ہوئے۔

وفد کے قیام حیدرآباد کے دوران جو جلسے اور مجلسیں ہوئیں ان میں ایک یادگار مجلس نواب عمادالملک کے یہاں منعقد ہوئی۔ اس مجلس کے علمی معیار اور مذاق سے علامہ شبلی بہت متاثر ہوئے۔ اسی تاثر کے زیراثر وہاں سے واپسی کے بعد انھوں نے ایک عربی قصیدہ عمادالملک کی خدمت میں ارسال کیا۔ اس قصیدہ کو سرسید نے اپنے نوٹ کے ساتھ گزٹ کے ۲۰/اکتوبر ۱۸۹۱ء کے شمارہ میں شائع کیا۔ یہ امر باعث حیرت ہے کہ اپنی ادبی اور فنی بلند پائیگی کے باوجود اس کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔ اس کی اہمیت اس لیے بھی بہت زیادہ ہے کہ علامہ شبلی نے عربی زبان میں صرف دو ہی قصیدے لکھے ہیں۔ ایک سرسید کی شان میں (۸) اور دوسرا یہ۔ دونوں ہی قصیدے گزٹ میں چھپے۔ سرسید کا قصیدہ تو ''حیات شبلی'' میں محفوظ ہو گیا (۹) لیکن دوسرا قصیدہ اب تک شائقین کی نظروں سے اوجھل رہا۔ اس کی اہمیت کے پیش نظر سرسید کے نوٹ کے ساتھ اسے یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

عربی نظم مولوی شبلی نعمانی

حیدرآباد میں جب کہ ڈیپوٹیشن وہاں گیا نہایت عمدہ عمدہ جلسے اور مجلسیں رہیں۔ سب سے زیادہ لطیف و نفیس مجلس نواب عمادالملک بہادر کی تھی جس میں بجز علمی چرچے اور علمی مذاق اور کچھ نہیں ہوتا تھا۔ مولانا شبلی کو وہ مجلس بہت پسند آئی تھی۔ جب وہ وہاں سے واپس آئے بیادگاری انہیں جلسوں کے ایک عربی نظم لکھ کر بعالی خدمت جناب عمادالدولہ عمادالملک مولوی سید حسین بلگرامی علی یارخاں بہادر موتمن جنگ میں بھیجی ہے۔ اس نظم کو ہم بھی اپنے اخبار میں چھاپتے ہیں:

كتمتُ الهوى دهرًا بحسن التجلُّدِ وقد ضاق ذرعي اليوم مما يكابدُ

فقد كان كتمانُ الهوى من مذاهبي وها أنا عن تلك المحجّة حائدُ

ومن سالفِ الأيام للناس كلِّهم مسالك شتّى في الهوى ومقاصدُ

نعم أدّعي حبَّ الأديب الممجَّد ولست أبالي ما يقول الحواسدُ

فإن كان دعوى الحبِّ منّي غوايةً فوالله إني في الغواية راشدُ

على أنني لم أقتحم عَقْبَةَ الهوى بطَوعٍ ولكنَّ الحبيب لَقائدُ

حللتُ ديارًا لم تكن بأوانسٍ على أنها تُرجى لديها الفوائدُ

فما عِلقتْ طرفي بشيء ولم يكن بها ما يُقِرُّ العينَ فيما أشاهدُ

فأما القصور الشامخات وما بها فإنّيَ في تلك الصناعة زاهدُ

بقيتُ زمانًا لا أفوز بصاحب يناشد بيتًا أو يعي ما أناشدُ

فلما تناهى اليأسُ وانقطع الرجا وأيقنتُ أني للأمانيِّ فاقدُ

تداركتِ الأقدارُ حتى بلغن بي إلى ذروةٍ تأوي إليها الأماجدُ

ففزتُ بحَبْرٍ ألمعيٍّ حُلاحِلٍ حريٍّ بأن تُهدى إليه القصائدُ

حليف العُلا السيِّدْ حسين الممجَّد له هممٌ في المكرمات صواعدُ

بقية خير من سلالة هاشم تشابهَ مولودٌ وجدٌّ ووالدُ

فأكرمني واختصَّني لفكاهةٍ فبتنا نحاكي الشعر والناسُ راقدُ

نُجاذبُ أطرافَ الكلام ونرتمي بمضماره طورًا وطورًا نطاردُ

فآبَ رُواءُ الشعر بعد ذهابه وهبَّت رياحُ العلم وهي رواكدُ

وكان شريكي في الصناعات كلِّها ولكن له فضلٌ على ذاك زائدُ

فهمّتُنا مقصورة في صناعة تُعَدُّ كثيرًا والحقيقة واحدُ

وهذا خبيرٌ بالمعارف كلها وذلك أمرٌ ليس يجحد جاحدُ

حواشی

(۱) انسٹی ٹیوٹ گزٹ، یکم ستمبر ۱۸۹۱ء، ص ص ۹۷۳۔ ۹۷۴۔ (۲) مولانا سید سلیمان ندوی، حیات شبلی، دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، ۱۹۹۱ء، ص ص ۱۶۸۔ ۱۷۰۔ (۳) حیات شبلی، ص ۱۸۳۔ (۴) انسٹی ٹیوٹ گزٹ، ۲۴/جولائی ۱۸۸۸ء۔ (۵) حیات شبلی، ص ص ۱۸۳۔ ۱۸۴۔ (۶) ایضاً، ص ص ۱۸۴۔ ۱۸۶۔ (۷) علامہ شبلی نعمانی، کلیات شبلی فارسی، دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، ۲۰۰۵ء، ص ص ۱۲۔ ۱۵۔ (۸) انسٹی ٹیوٹ گزٹ، ۱۵/اکتوبر ۱۸۸۱ء۔ (۹) حیات شبلی، ص ص ۱۱۸۔ ۱۲۰۔

وفیات

ڈاکٹر جسٹس جاوید اقبال مرحوم

دارالمصنّفین میں یہ خبر بڑے افسوس کے ساتھ سنی گئی کہ ۲/اکتوبر کو پاکستان کے سابق چیف جسٹس، ممتاز قانون داں، دانشور اور مفکر ڈاکٹر جاوید اقبال (پ: ۵/اکتوبر ۱۹۲۴ء) لاہور میں اس دنیائے فانی سے رخصت ہوگئے، انا للہ وانا الیہ راجعون، حیات جاوید کی مدت قریب بانوے سال رہی اور یہ مدت بظاہر جاوید نام کی معنویت کی حامل ہی کہی جائے گی، نام تو ان کا ان کے بڑے بھائی آفتاب کی رعایت سے قمر رکھا گیا تھا لیکن والد نے خدا جانے کن دعاؤں اور جذبوں سے قمر کی جگہ جاوید لفظ کا انتخاب کیا، خود مرحوم کو اس معنویت کا اندازہ تھا اسی لیے کہا کہ برصغیر میں شاید کوئی بھی میرا اہم نام مجھ سے عمر میں بڑا نہ ہوگا۔

برکت عمر ہی میں نہیں ہوئی، تعلیم، ملازمت اور شہرت میں بھی اس کا اثر ظاہر ہوا، لاہور سے تعلیم کا سلسلہ دراز ہوا تو یورپ تک پہنچا، قانون کی تعلیم نے اپنے پیشہ میں بلند ترین منصب تک پہنچا دیا۔ قانون ان کا خاص مضمون رہا لیکن وابستگی ادب و فلسفہ سے اسی درجہ رہی، ان سب کے امتزاج نے ان کو یک گونہ امتیازی حیثیت بھی عطا کی۔ جس کا اندازہ ان کی انگریزی کتاب اسلام اینڈ پاکستان آئیڈنٹٹی اور اردو میں مئے لالہ فام، زندہ رود اور اپنا گریباں چاک جیسی کتابوں سے کیا جاسکتا ہے۔ جن سے ان کی شہرت اور وقعت میں اضافہ ہوا لیکن حقیقت یہی ہے کہ ان کی شہرت بلکہ شہرت جاوداں تو اسی وقت ہوگئی تھی جب علامہ اقبال نے اپنے بیٹے کے نام یہ پیغام دیا کہ ع

خودی کے ساز میں ہے عمر جاوداں کا سراغ

ضرب کلیم میں جب اقبال نے یہ دعا دی کہ ع

خدا کرے کہ جوانی تری رہے بے داغ

تو اس وقت جاوید کی عمر ہی کیا تھی، علامہ کا انتقال ہوا تو اس وقت جاوید قریب تیرہ سال کے تھے لیکن اقبال ان کو امت کی اس نئی نسل کی شکل میں دیکھتے تھے جس کے لیے ان کا کلام اور کلام کیا ذوق نگہ

اوراس سے بڑھ کر سوختن در لا الٰہ عام اور وقف تھا، لا الٰہ کی حقیقت ان کے لیے دولت جاوید تھی، جاوید کے ذریعہ امت کے ہر جاوید کے لیے لا الٰہ گوئی کی یہ تمنا اس لیے تھی کہ

تاز اندام تو آید بوے جاں

عالمی ادب کا علم نہیں لیکن اردو ادب میں جاوید و اقبال یا باپ بیٹے کی شاید ہی کوئی ایسی مثال مل سکے۔ جاوید کو بچپن ہی سے جیسے حیات جاوید کی بشارت مل گئی لیکن یہ بشارت ایک بڑی ذمہ داری کا اعلانیہ بھی تھی، جاوید صاحب نے جب اپنا گریباں چاک کیا تو اس گراں باری کا احساس ہوا بھی۔ فرزند اقبال ہونے کے اس بوجھ کو بچپن اور جوانی تک انہوں نے کسی طرح برداشت کیا لیکن جب زندگی میں انہوں نے ایک مقام پیدا کیا اور اس وقت بھی باپ کے حوالے سے ان کی شناخت کی گئی تو ان کو یہ اس لیے اچھا نہیں لگا کہ یہ ''ان کی انا کی نشو و نما میں مداخلت تھی'' وہ خود سے یہی سوال کرتے رہے کہ ایک بڑے درخت کے سائے سے نکل کر کیا وہ خود بھی اپنا سایہ بنا سکے؟ اس سوال کا جواب اتنا آسان نہیں لیکن انہوں نے جس منفرد انداز میں علامہ اقبال کی زندگی کا جھٹپٹے کے عالم میں مشاہدہ اور پھر مطالعہ کیا اور زندہ رود کے نام سے پیش کیا وہ بجائے خود ان کا کارنامہ بلکہ نگہ دانشورانہ کا کمال ہے۔ انہوں نے ۷۵ء میں اس وقت حیات اقبال لکھنے کا ارادہ کیا جب اقبال کی زندگی، شاعری، ساحری پر ایک خزانہ کتب جگمگا رہا تھا لیکن جاوید مرحوم کو یہی احساس تھا کہ کتابیں تو بہت ہیں لیکن سوانح عمری کے طور پر لکھی گئیں کتابیں نسبتاً کم ہیں اور جو ہیں بھی وہ تفصیلات کے لحاظ سے ناکافی ہیں۔ زندہ رود کا پہلا ایڈیشن جب ۷۹ء میں سامنے آیا تو اسی وقت یہ تاثر عام ہوا کہ اس میں خیالات کے ارتقا پر زیادہ توجہ ہے، نجی پہلوؤں پر کم، اقبال خود کچھ اسی فکر کے قائل تھے اس لیے بیٹے نے شعوری طور پر ترجیح اسی حیثیت کو دی۔ زندہ رود نام رکھنے میں بھی یہی احساس تھا کہ

سناتی ہے یہ زندگی کا پیام

زندہ رود کا پہلا حصہ تشکیلی دور کے عنوان سے تھا، دوسرا حصہ وسطی دور کے لیے خاص ہوا، ۱۹۰۸ء سے ۱۹۲۵ء تک کے اس دور کے متعلق جاوید مرحوم کی یہ رائے ان کی نظر کی بالیدگی کا خود اعلان کرتی ہے انہوں نے لکھا کہ (اس دور میں) ''اقبال کی شاعری نے آواز رحیل کارواں، نغمہ جبرئیل آشوب یا جزو پیغمبری بننے کے لیے جست نو لے لی تھی لیکن عقل یاراں ابھی تک محو تماشائے

لب بام تھی''۔۸۱ء میں زندہ رود کا حصہ دوم شائع ہوا تو ٹائٹل کی پشت پر معارف کے اس تبصرہ کا ایک حصہ نمایاں تھا جو سید صباح الدین عبدالرحمان مرحوم کے قلم کا ترجمان بن کر نکلا تھا، یہ معارف اور دارالمصنّفین کے لیے جاوید مرحوم کی محبت وعقیدت کا یقیناً غماز تھا۔

علامہ اقبال اپنے سوانح نہیں لکھ سکے تھے، لائق پسر نے یہ کام تو پورا ہی کیا، خود اپنے سوانح لکھ کر اور 'اپنا گریباں چاک' عنوان بنا کر اپنی زندگی کے سر کو بھی فاش کر دیا۔ اقبال نے کہا تھا کہ میرے خیالات کا تدریجی انقلاب سبق آموز ہوسکتا ہے، جاوید اقبال کے خیالات کا تدریجی انقلاب عبرت آموز بھی ہے۔ یہ داستان قطرے سے گہر بننے سے زیادہ قطرے کے سمندر میں فنا ہونے کی کیفیت رکھتی ہے۔ یہ جاوید نامہ واقعی ایک اضطراب مسلسل کا عمل ہے، جہاں علم وفن، دین وسیاست اور عقل ودل سب یوں ہیں کہ زوج زوج اندر طواف آب وگل

اور یہ اس لیے ہے کہ پس منظر میں جہان اقبال کے رنگ رہ رہ کر ابھرتے ہیں۔ انہوں نے جب ہندوستان میں مسلم قومیت کو اپنی تحقیق کا موضوع بنایا تو سرسید وشبلی نے ان کو خاص طور پر متاثر کیا۔ سرسید سے اس لیے متاثر ہوئے کہ ان کی نظر میں وہ پہلے تھے جنہوں نے ماضی کی طرف منہ کرنے اور مستقبل کی طرف پیٹھ کر کے کھڑے ہونے سے منع کیا، شبلی ان کی نگاہ انتخاب میں اس لیے آئے کہ شبلی کی توجہ کا مرکز مسلم کاشتکار تھے اور بقول جاوید جیسے ان کے ذہن میں اسلام کا تصور بحیثیت ایک فلاحی ریاست موجود تھا، مطالعہ شبلی میں اس نکتہ پر اچھے اچھے شبلی شعاروں کی نظر نہیں گئی۔ یہ جاوید مرحوم کے مطالعہ کی گہرائی ہے جس نے اس پہلو کو ڈھونڈھ نکالا۔ اپنا گریباں چاک اور زندہ رود میں فرق وہی ہے جو خود اقبال اور جاوید میں ہے۔ اسے آرزو اور حسرت کا فرق بھی کہہ سکتے ہیں، نیا زمانہ اور نئے صبح وشام پیدا کرنے کی آرزو ایک طرف تو دوسری طرف بڑی سچائی سے یہ حسرت کہ کاش میں ان جوانوں میں سے ہوتا جو مجوزہ اسلامی ریاست کو عملی طور پر وجود میں لاسکنے کے قابل تھے۔ صداقت کا اگر اجر ہے اور یقیناً اجر ہے تو شاید جاوید کا یہ اعتراف کہ افسوس میں آپ (اقبال) کی خواہش کے مطابق جاوید نہ بن سکا۔ ان کے لیے وجہ بخشش بن جائے یہ تو جاوید مرحوم کا اپنا احساس ہے ورنہ اس تعلیم کے اثر سے انکار ممکن نہیں جس کا حرف مطلب تھا ع سر دین مصطفیٰ گویم ترا اور اس دعا کی تاثیر میں شک کیسے کیا جائے۔ ہم بقبر اندر دعا گویم ترا۔ اللھم اغفر لہ وارحمہ۔

آہ مولانا سید نظام الدین رحمہ اللہ

۱۷/اکتوبر غازی پور کے مدرسہ دینیہ میں رابطہ ادب اسلامی کے علاقائی سمینار کی شام تھی کہ اچانک یہ خبر ملی کہ مولانا سید نظام الدین صاحب کو ان کے مالک حقیقی نے اپنے جوار رحمت کے لیے بلا لیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

وہ ایک مدت سے صاحب فراش تھے، عمر بھی نوے کے قریب تھی، تاریخ پیدائش ۱۳۱/ مارچ ۱۹۲۷ء بتائی جاتی ہے۔ مولانا کا شمار ان چند شخصیتوں میں کیا جاسکتا ہے جن کے متعلق پورے یقین سے کہا جاتا ہے کہ ان کا جانا کسی سانحہ سے کم نہیں یا جن کو جام و پیمانہ مدتوں رویا کریں گے۔

۱۹ سال کی عمر میں دارالعلوم دیوبند سے اور شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی سے تعلق نے جس زندگی کی ساخت پرداخت کی، زندگی کے کسی مرحلے میں سست روی کا اس سے کوئی گلہ نہیں رہا۔ تعلیم، تدریس، تنظیم، تبلیغ ہر جگہ توفیق الٰہی شامل حال رہی۔ بہار کی مشہور و فعال امارت شرعیہ کے ناظم ہوئے، یہ ۶۵ء کی بات ہے اور یہیں سے ملت کے مسائل پر نظر اور ان کے حل کرنے کی فکر کی صلاحیت اس طرح سامنے آئی کہ وہ ناظم سے امیر شریعت بہار ہوئے۔ بعد میں وہ مسلم پرسنل لا بورڈ کے جنرل سکریٹری منتخب ہوئے، اس حیثیت سے انہوں نے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، مولانا قاضی مجاہد الاسلام اور مولانا سید محمد رابع ندوی مدظلہ کی صدارت کے مختلف ادوار اور بعض اوقات نہایت مشکل حالات میں جس طرح بورڈ کی قیادت کی وہ غیر معمولی ہے اور اسی لیے ہمیشہ یاد رکھنے اور قدر کیے جانے کے لائق ہے۔ اس اجمال کی تفصیل وہی بیان کر سکتے ہیں جن کو بورڈ جیسے ہمہ گیر اور جامع اضداد عناصر کے مجموعہ کی ہیئت ترکیبی کو قریب سے دیکھنے کی فرصت ملی۔ لیکن جو معتبر ترین شاہد ہیں ان کی روایت اور شہادت کا اتفاق اس پر ہے کہ مولانا کے مشورے، ان کی حکمت و دانش مندی، معاملہ فہمی ایسی تھی کہ پیچیدہ سے پیچیدہ عقدہ کو بھی وہ اپنے ناخن تدبیر سے حل کر دیتے تھے۔ یقیناً اس صلاحیت کا فیضان عام نہیں، اس کے لیے اخلاص و احسان، اعتدال و توازن اور سب سے بڑھ کر ریا و نمود سے نفور جیسی خوبیاں درکار ہوتی ہیں۔ مولانا نظام الدین صاحب کو جنھوں نے بہت زیادہ نہیں دیکھا وہ بھی ان کی سادگی، خاکساری اور داستانوں میں نظر آنے والے بزرگوں کی پرشفقت

سایہ داری کی گواہی دے سکتے ہیں۔لوگوں نے گواہی دی بھی مثلاً ایک نسبتاً کم معروف لیکن معتبر شخصیت نے کہا کہ مولانا کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ان کے ظاہر و باطن میں کوئی تضاد نہیں، آدمی ان سے جتنا قریب ہوتا اس کی عقیدت اتنی ہی توانا ہوتی جاتی۔

یہی وجہ ہے کہ بے شمار اداروں نے سر پرستی کے لیے ان کی جانب نظر کی،فقہ اکیڈمی، ملی کونسل، دیوبند، ندوہ، المعہد العالی، پٹنہ اور خدا جانے کتنے اور اداروں کے وہ رکن اور ذمہ دار رہے، دین کے نظام کی حفاظت وصیانت میں وہ واقعی اسم بامسمیٰ ہوئے۔مولانا کی ایک خوبی ادب کا عمدہ اور نکھرا ذوق تھا۔سخن فہم تھے،خود ان کا سخن بڑا دلنواز ودلکش تھا،شعر گوئی کی فرصت ظاہر ہے کم ملی لیکن طبیعت جب ادھر آتی تو چل نکلتی، یہ اشعار خاص کیفیتوں ہی میں کہے جا سکتے ہیں:

میں ان کی یاد کو وجہ سکون دل سمجھتا ہوں یہی دولت ہے جس کو عمر کا حاصل سمجھتا ہوں
مری کشتی کو طوفان حوادث کا گلہ کیوں ہو کہ ہر موج بلا کو اک نیا ساحل سمجھتا ہوں
رندوں میں کیا ہے لغزش مستانہ کے سوا واعظ ترا بیان حکیمانہ چاہیے
بادہ بغیر مینا و پیمانہ چاہیے ساقی کی اک نگاہ کریمانہ چاہیے

ڈاکٹر غیاث الدین صدیقی ندوی مرحوم

علی گڑھ کے مشہور طبیب و معالج ڈاکٹر غیاث الدین صدیقی نے بھی اس دنیائے فانی کو الوداع کہا، اب کیا کہا جائے کہ طبیب و معالج تو بہت ہیں، مسیحا نفس کتنے ہیں؟ معالج تو وہ بھی شکریہ کے لائق جس کی نباضی اور تشخیص، ظاہری بیماریوں سے شفا بخشے لیکن اگر یہ علاج جسم کے ساتھ روح وجاں کا بھی ہو اور سامان میں دوائے دل بھی شامل ہو تو شکریہ کے ساتھ شکر کی کیفیت کو شامل ہی ہونا چاہیے۔ڈاکٹر صاحب مرحوم اللہ کے ان بندوں میں تھے جن کے ذریعہ جسم وجاں کی صحت، مقدور بھر عام ہوئی، انہوں نے مسلم یونیورسٹی کے علی گڑھ میں اسی کے زیر سایہ مدرسۃ العلوم الاسلامیہ قائم کیا، مدرسۃ العلوم تو مسلم یونیورسٹی کا پہلا اور اصل نام ہے لیکن الاسلامیہ کے اضافہ نے اصل مقصد کی یاد کو بھی زندہ کر دیا، اس مدرسہ کے لیے انہوں نے اپنی ساری توانائی صرف کر دی۔ لائق استادوں اور کارگزاروں کی ایک جماعت تیار کی، طلبہ کے لیے خصوصی علمی مجلسوں کا اہتمام کیا،

علامہ شبلی، مولانا سید سلیمان ندوی اور رفقائے دارالمصنّفین پر بھی توسیعی خطبات کیے۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے افکار پر ایک بین الاقوامی سمینار کے انعقاد کی روح بن کر قابل رشک بن گئے۔ قابل رشک تو وہ اپنی فروتنی، انکسار، تواضع اور دل میں اتر جانے والی خندہ جبینی سے پہلے بھی تھے، ملت کا درد رکھنے والے اور گوشۂ تنہائی میں ایسی خاموش خدمات والے اب ہیں ہی کتنے؟ ایسے میں ہر کمی نا قابل تلافی لگتی ہے۔ اللہم ارحمہ

جناب محمد ہارون مرحوم

آہ ہمارے ہارون بھی اچانک رخصت ہو گئے اور اپنے ساتھ محبت وخوش کلامی کے وہ رنگ بھی لے گئے جو دوسروں کے لطف ولذت کا سامان تھے۔ وہ مولانا عبدالسلام ندوی کے خانوادہ سے تعلق رکھتے تھے، صابو صدیق پالی ٹیکنک کے پرنسپل کی حیثیت سے یادگار کام کیے، علم کی دولت محروموں تک پہنچانے کا عجیب جذبہ تھا، اسی کا اثر تھا کہ ڈھائی ہزار سے زیادہ ایسے بچے انجینئر نگ کی تعلیم پا سکے جو نہایت غریب تھے، ممبئی میں ان کے کاموں کا اعتراف عام تھا لیکن انہوں نے مولانا عبدالسلام ندوی کی شخصیت اور ان کی علمی خدمات کو عام کرنے کا فرض کفایہ ادا کیا اور اس کے لیے انہوں نے پہلے ممبئی میں نئی عیسوی صدی کے آغاز میں ایک شاندار سمینار کیا اور پھر اس کی کامیابی سے تقویت پا کر مولانا عبدالسلام فاؤنڈیشن قائم کیا اور پھر مسلسل مولانا ندوی کے متعلق کتابیں شائع کرتے رہے۔ دو مہینے پہلے ڈاکٹر گلشن طارق کی کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا گیا تھا کہ یہ فاؤنڈیشن کی دسویں پیش کش ہے۔ ہارون بھائی نے کیسی خاموشی سے دس کتابیں شائع کر دیں، ان کی بڑی خواہش تھی جس کا اظہار وہ مسلسل کرتے کہ الہلال میں مولانا عبدالسلام ندوی کی تحریروں کو نئے سرے سے تلاش کیا جائے اور ان کا ایک مجموعہ شائع کیا جائے۔ افسوس بعض سخت اور جاں کاہ حوادث نے خود ان کی زندگی مختصر کر دی، مگر یقین ہے کہ ان کی نیکی اور دوسروں کے لیے بھلائی، ان کے حق میں روز حساب باعث مغفرت ہوگی۔ اللہم اغفرلہ

ع۔ص

ادبیات

غزل

ڈاکٹر جمیل مانوی

پھول سے چہرے جو یوں خاک میں غلطاں ہوں گے
پھر اسی خاک سے پیدا نئے امکاں ہوں گے

جگمگا اٹھیں گے گمنام شہیدوں کے مزار
کسی مجبور کے آنسو جو فروزاں ہوں گے

ان چراغوں کو فصیلوں سے ہٹاتے کیوں ہو
کل کی دنیا کے یہی مہر درخشاں ہوں گے

میرے ماضی کے دفینوں کو حقارت سے نہ دیکھ
نئی تعمیر کا اک دن یہی ساماں ہوں گے

نہ عدالت نہ دیانت نہ محبت نہ خلوص
تیرے افسانے کے کچھ اور ہی عنواں ہوں گے

اپنے عیبوں کو ذہانت سے چھپانے والے
آئینے جب تجھے دیکھیں گے تو حیراں ہوں گے

یہ زمیں اپنے کناروں کو سمیٹے گی ضرور
پھر یہی اہل زمیں، خود پہ پشیماں ہوں گے

خیر خواہوں کو ترستی ہے نگاہ افلاک
جانے کس روز مرے داغ فروزاں ہوں گے

ظلم کو ظلم کوئی کہہ دے تو مجرم ہے جمیلؔ
پھر وہی دار و رسن پھر وہی زنداں ہوں گے

وہ جانشین منت رحماں چلا گیا

امیر شریعت حضرت مولانا سید نظام الدینؒ کے سانحۂ ارتحال سے متاثر ہوکر

جناب وارث ریاضی

وہ ترجمان سنت و قرآں چلا گیا
رشد و ہدیٰ کا نیر تاباں چلا گیا
وہ حضرت امیر شریعت امام قوم
وہ جلوہ زار محفل ایماں چلا گیا
وہ ناخدائے کشتی ملت نہیں رہا
وہ جانشین منت رحماں چلا گیا
وہ پیکر خلوص و وفا منبع سخا
آئینہ دار عظمت انساں چلا گیا
اہل چمن حزیں، گل و لالہ اداس ہیں
وہ عندلیب صحن گلستاں چلا گیا
شیریں بیاں خطیب و ادیب بلیغ بھی
وہ شاعر فصیح و سخن داں چلا گیا
وہ جس کی کوششوں سے امارت ہے ضو فشاں
جہد و عمل کا وہ مہ تاباں چلا گیا
رحلت پہ اس کے شاہ ولی سوگوار ہیں
سجاد کے چمن کا نگہباں چلا گیا
در دو ہزار و پنج و دہ وارثؔ حزیں
در ساکنان خلد بریں شد نظام دیں

کاشانۂ ادب، سکٹا دیوراج، بسوریا، وایا لوریا، مغربی چمپارن بہار، ۸۴۵۴۵۳۔

مطبوعات جدیدہ

سیرت شبلی: علامہ اقبال احمد خاں سہیل، تصحیح و ترتیب مولوی فضل الرحمٰن اصلاحی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۱۸۲، قیمت ۱۵۰/روپے، پتہ: ضیاء الدین خاں میموریل اسکول، بڑھریا، اعظم گڑھ اور البدر بک سینٹر، سرائے میر اعظم گڑھ۔

علامہ اقبال سہیل کی شاعری، طباعی اور ذہانت ان کی کتاب شہرت کے الگ الگ عنوان ہیں، ڈاکٹر ذاکر حسین نے ان کو شعر و تنقید وادب کا امام کہا تو یہ بھی کہا کہ ان جیسا ذہین شخص اب تک دیکھنے میں نہ آیا۔ وہ علامہ شبلی کے ہم قبیلہ و ہم وطن تو تھے ہی، شاگرد بھی تھے، تلمذ کی مدت گو کم رہی اور صرف عربی کی درسیات تک محدود رہی مگر یہ جذبہ سپاس تھا جس نے یہ کہلایا کہ آج علم وادب کا جو سرمایہ اس ناچیز کے پاس ہے وہ سب اسی آستانہ کا فیض ہے۔ اور شاید اسی احساس کی شدت سے وہ خود کو آستانۂ شبلی کا غلام کہلانے میں شاہی محسوس کرتے تھے۔ علامہ شبلی کے انتقال کے بعد جب سیرت شبلی لکھنے کی بات آئی تو سب سے پہلے نظر اقبال سہیل ہی پر گئی اور یہ خدمت باضابطہ ان کے سپرد کردی گئی۔ انہوں نے اس کا آغاز بھی کیا لیکن حالات اور مزاج نے ان کو وہ فرصت نہ دی جو اس عظیم کام کے لیے مطلوب تھی، تاہم انہوں نے جو لکھا وہ اگرچہ نامکمل تھا لیکن یہ رسالہ الاصلاح میں قسط وار شائع ہوا۔ پھر وقت کے ساتھ الاصلاح کے یہ رسالے نایاب سے ہو گئے تو یہ نامکمل سیرت بھی گویا اوجھل ہو گئی، شبلی صدی کے موقع پر دارالمصنّفین کے علاوہ کام ہوئے ان میں الاصلاح کی فائلوں سے نکال کر کتابی شکل میں زیر نظر کتاب کی اشاعت بھی ہے، جو دراصل ایک نعمت سے کم نہیں۔ حیات شبلی، ذکر شبلی، شبلی نامہ مبدل بہ یادگار شبلی اور شبلی ایک دبستان یہ وہ کتابیں ہیں جو شبلی کو مختلف زاویوں سے دیکھنے میں اب مراجع کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان میں نامکمل ہی سہی اپنی انفرادی شان کے لحاظ سے یہ کتاب بھی ہے، مولانا کے ابتدائی حالات سے حیدرآباد تک حیات شبلی کے اہم مراحل اس میں موجود ہیں، چونکہ شنیدہ کے بجائے معاملہ دیدہ کا ہے اس لیے بھی حیات شبلی کے بعد

اسی کو استنادی درجہ کا حق ہے، اس پر مستزاد مصنف کا زور قلم، جس کے نتیجہ میں ایسے جملے ستاروں کی طرح بکھرے ہیں کہ "علامہ کی ذات گویا جونپور کے صحیفہ کمال کی آخری آیت تھی، اس کے بعد علوم شرقیہ کی بزم ہی برہم ہوگئی۔۔۔ایک دو حاشیہ نشینان بساط جنھوں نے ہنگامہ دوشیں کا آخری سماں دیکھا تھا وہ بھی اب خواب عدم میں ہیں"۔ نعمانی کی نسبت وہ لکھتے ہیں کہ یہ مولانا کا تخلص تھا، وجہ انتخاب فقہ حنفی کی مذہبی عصبیت تو تھی ہی فارسی شعرا کے تخلص میں بالعموم یائے نسبتی کے رواج کا تتبع بھی مقصود تھا، بس شرط یہ تھی کہ خاقانی وقاآنی کی طرح مترنم و پر شکوہ ہو، اچھوتا ہو اور بہ لحاظ واقعہ بھی صحیح ہو" خوش قسمتی سے نعمانی ان تمام شرائط کا جامع تھا۔۔۔ورنہ یہ باعتبار نسب یا مقام نہیں، مولانا کو قدرت نے نسل و وطن کے ادنیٰ جذبات سے بہت بلند فطرت عطا کی تھی"۔ سرسید کا ذکر آیا تو لکھا کہ "ان کے آگے بڑی سے بڑی ہستیوں کو بھی سر نیاز خم کر دینا پڑا، علامہ شبلی سب سے کم سن تھے، اس لیے ان کا مسخر ہوجانا بظاہر سب سے زیادہ آسان تھا۔۔۔مگر قرب کے ساتھ کشش اور کشش کے ساتھ کشمکش کا بڑھنا ہی قدرت کا عالم گیر اصول ہے"۔ سرسید علی گڑھ اور شبلی کے بیان میں اس کتاب میں بہت کچھ ہے اور یہ سب سے جدا بھی ہے۔ ایک جگہ یہ دلچسپ جملہ بھی آگیا ہے کہ علامہ شبلی سے مولوی عبدالحق کی مخالفت اور اس کا ابتدائی سبب بنائے فاسد علی الفاسد کی بہترین مثال ہے" مصنف خود رزم گاہ سیاست سے مانوس تھے لکھا کہ علامہ شبلی کے مذہبی رجحانات میں تو درجہ بدرجہ تبدیلیاں بھی ہوئیں لیکن سیاسیات میں ان کی رائے ابتدا سے وہی تھی جس پر آخر تک قائم رہے، مسلمانوں کا مخصوص جماعتی مفاد اور ان کی قومی وسیاسی ترقی کا خیال ان کو کسی لیڈر سے کم نہ تھا مگر یہی خیال ان کو کانگریس کی مخالفت سے روکتا تھا"۔ غرض اس نامکمل سیرت شبلی میں پڑھنے والوں کے لیے تشنگی کا احساس نہیں ہوتا۔ اس کو مرتب کرکے اور بعض مفید مضامین کا اضافہ کرکے لائق مرتب نے داد کے لائق کام کیا ہے، ان کا مقدمہ بھی خاصا ہے، نصف صدی سے زیادہ مدت میں جو خدمت دوسروں کے نصیب میں نہ آئی وہ ان کو خوش نصیب بنا گئی، اس سے پہلے ان کی مرتب کردہ دو کتابیں آچکی ہیں جو ان کی تالیفی صلاحیت کا اچھا اظہار ہیں۔ کہیں کہیں توجہ کی ضرورت اور بھی ہے مثلاً ایک جگہ لکھا گیا کہ علامہ مرحوم نے سیاسیات کی تکمیل مولانا فاروق ہی سے کرلی۔ یہاں سیاسیات کا لفظ تشریح طلب ہے۔

تذکرہ شعرائے کانپور: مولفین جناب سلیم عنایتی اور جناب فاروق جائسی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد، صفحات ۳۴۶، قیمت ۳۰۰/روپے، پتہ: سلیم عنایتی ۵۷/۴۰، پریڈ کانپور نمبر ۱، اور ناظر صدیقی ۱۵۵/۱۰۵، چمن گنج کانپور۔

گنگا کنارے کانپور کو لاکھ کہا جائے کہ ع بہتر لب کوثر سے ہے گنگا کا کنارا۔ مگر حقیقت یہی ہے کہ محنت کشوں، تاجروں اور ثروت مندوں کی کثرت کے باوجود شعر وادب میں دہلی ولکھنؤ کیا یہ ہمسر رامپور بھی نہیں مانا گیا، لیکن انصاف والوں کی نظر میں یہ ناانصافی تھی اور اس کی چھوٹی سی روداد اس کتاب کے پیش لفظ میں بھی یوں آگئی ہے کہ ندوہ کا نقش اول فیض عام اور مطبع مصطفائی و نظامی اور رسالہ زمانہ کے حوالے سے یہ شہر علم وادب کے خدمت گزاروں بلکہ محسنوں کی صف میں نظر آتا ہے، رجب علی بیگ سرور، ناسخ، منیر شکوہ آبادی اور میر علی اوسط رشک نے احساس برتری میں مبتلا ذہنوں کو رشک پر مجبور کردیا۔ بس قدر اور ناقدری کا یہی جذبہ ہے جس نے اس کتاب کی تالیف پر آمادہ کیا اور دیکھتے دیکھتے حسرت موہانی، زیب غوری سے نشور واحدی اور فنا نظامی تک تین سو ساٹھ شاعروں کی یاد تازہ کردی گئی۔ شعر کے اس صنم خانہ میں تین سو ساٹھ کے عدد کی معنویت بھی خوب ہے۔ مولفین حسن سلیقہ رکھتے ہیں اسی لیے دو بڑے ابواب کے تحت حروف تہجی اور زمانۂ پیدائش کے حساب سے شعرا کے مختصر اور کہیں قدرے مفصل حالات اور نمونہ کلام کو اس طرح پیش کردیا گیا کہ کانپور کا رخ روشن کہہ اٹھا کہ

ادھر جاتا ہے دیکھیں یا ادھر پروانہ آتا ہے

اس کے علاوہ سبد گل عنوان کے تحت کچھ اشعار خاص کیے گئے، ان کو چنندہ کہا گیا لیکن ہیں یہ چنیدہ ہی ہے، ایک دو شعر ہم نے بھی چن لیے جیسے

یہ بھی نہ پوچھا کبھی صیاد نے — کون رَہا کون رِہا ہوگیا

عجز ونخوت نے قدم جب گھر سے باہر رکھ دیا — پاؤں پر سر میں نے اس نے پاؤں سر پر رکھ دیا

کودا کوئی یوں گھر میں ترے دھم سے نہ ہوگا — جو کام ہوا ہم سے وہ رستم سے نہ ہوگا

آنکھ مچولی کھیل رہا ہوں یوں بیٹھا تنہائی میں — خود ہی چھپا دیوار کے پیچھے خود ہی چلا انگنائی میں

ذبح کے وقت وہ لذت ہے کہ دل کہتا ہے سر اسی طرح تہہ بازوئے جلاد رہے

ان کے لطف عام کو غیرت نہیں کرتی قبول اور میں کم بخت لطف خاص کے قابل نہیں

کچھ دیر میں آجائے گی یہ دھوپ وہاں بھی تو جان نہ دے سایۂ دیوار کے پیچھے

ایسے اشعار کے بعد فرصت کسے کہ وہ لکھنؤ اور کانپور کا فاصلہ دیکھے۔

سمٹتا سائبان: ڈاکٹر شکیل احمد، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۱۶۰، قیمت ۱۲۰/روپے، پتہ: مصنف، قاسمی منزل، ڈومن پورہ مئوناتھ بھنجن اور فہیم بک ڈپو، صدر چوک، مئوناتھ بھنجن ۔

ڈاکٹر شکیل احمد اپنی دو اہم کتابوں ''اردو انسانوں میں سماجی مسائل کی عکاسی'' اور ''مئوشہر ہنروراں'' کی وجہ سے ادبی حلقوں میں معروف ہیں۔ ادب میں اعلیٰ اخلاقی اقدار کی پاسداری اور لب ولہجہ کی شرافت ومتانت ان کی تحریروں کی علامت ہے۔ پروفیسر محمود الٰہی، پروفیسر احمر لاری، اختر بستوی اور ڈاکٹر افغان اللہ سے انہوں نے کسب فیض کیا اس کتاب میں ان کی اور کچھ اور عزیزوں کی یادوں کو انہوں نے بڑے پراثر انداز میں پیش کیا ہے۔ اساتذہ اور بزرگ متعلقین کی یادوں کو روشن کرنے کا مقصد صرف احسان شناسی ہی نہیں بلکہ ان کی زندگی سے دوسروں کو بھی روشنی بخشنا ہے، یہ وہ ہیں جن کی حیثیت یقیناً سائبان کی ہوتی ہے، جہاں سکون بھی ہے، سایہ بھی اور آسودگی بھی۔ دو مضمون اور ہیں جن میں دل کا درد پوری طرح آ گیا ہے، ایک ان کی اہلیہ مرحومہ اور دوسرے ان کے مرحوم جوان بیٹے پر ہے۔ صحیح کہا کہ ان حادثات نے ثابت قدمی اور عزائم کا ایسا امتحان لیا کہ زندگی میں اپنے وجود کے کھونے کا احساس ہوا۔ سائبانوں کے سمٹنے کا یہ عمل انسان کے ساتھ ہمیشہ سے ہے اور رہے گا، سوانحی خاکوں کے عنوان جو بھی ہوں لیکن ان کے پس منظر میں خدا جانے کتنے پڑھنے والے خود کو اپنے سمٹتے سائبانوں میں پائیں گے، آنکھوں کے خالی پن اور دلوں کی ویرانی کوئی حد ہو بھی نہیں سکتی۔

ع۔ص

رسید موصولہ کتب

۱۔ ازالۃ الشکوک (جلد اول تا چہارم): علامہ رحمت اللہ کیرانوی، تحقیق و تسہیل مولانا عتیق احمد قاسمی بستوی، مکتبہ احسان، ندوہ روڈ، ڈالی گنج لکھنؤ۔ مجموعی قیمت (مکمل سیٹ) ۱۲۰۰/روپے

۲۔ المحدث الکبیر، محمد زکریا الکاندھلوی وجہدہ فی السنۃ النبویہ: ڈاکٹر محمد اشرف علی الندوی، المجمع العلمی الاسلامی، ندوۃ العلما لکھنؤ۔ قیمت ۶۰۰/روپے

۳۔ بضاعتی (میرا لیکھا جوکھا مع میری کتھا): مسعود الرحمٰن خان ندوی ازہری، مکتبہ دین و دانش، ۱۳۔ مسجد شکور خاں روڈ، بھوپال۔ قیمت ۱۰۰/روپے

۴۔ تاریخ اصلاح و تربیت (جلد اول): مولانا محمود حسن حسنی ندوی، سید احمد شہید اکیڈمی، دار عرفات، تکیہ کلاں، رائے بریلی، یوپی۔ قیمت درج نہیں

۵۔ دبستان شبلی اور اقبال: ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، آواس وکاس کالونی، اعظم گڑھ۔

قیمت ۲۵۰/روپے

۶۔ زیتون کے سایے: فاخر جلال پوری، محلہ قاضی پورہ، جلال پور، امبیڈکر نگر۔

قیمت ۱۲۵/روپے

۷۔ شبلی نعمانی شخصیت اور عصری معنویت: پروفیسر سید محمد ہاشم، ڈاکٹر شہاب الدین ثاقب، سنٹر آف ایڈوانسڈ اسٹڈی، شعبہ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔ قیمت ۳۰۰/روپے

۸۔ شذرات ریاض شروانی: ریاض الرحمٰن خاں شروانی، مرتب ڈاکٹر فخر عالم ندوی، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ۔ قیمت ۳۵۰/روپے

۹۔ مولانا سید احمد ہاشمی حیات و خدمات: سعود الحسن ندوی غازی پوری، مکتبہ ندویہ، دار العلوم ندوۃ العلما لکھنؤ۔ قیمت ۱۴۰/روپے

۱۰۔ وفیات (پندرہ روزہ نشان منزل): مسعود الرحمٰن خاں ندوی ازہری، مکتبہ دین و دانش، ۱۳۔ مسجد شکور خاں روڈ، بھوپال۔ قیمت ۲۰۰/روپے

۱۱۔ یاد ماضی: ترتیب ڈاکٹر شجاع الدین فاروقی، اے۔ ایم۔ یو، سٹی رٹائرڈ، ٹیچرس ایسوسی ایشن، علی گڑھ۔ قیمت درج نہیں

تصانیف علامہ شبلی نعمانیؒ

کتاب	قیمت
سیرۃ النبیؐ جلد اول و دوم (یادگار ایڈیشن)	2000/-
سیرۃ النبیؐ	
(خاص ایڈیشن مکمل سیٹ ۷ جلدیں)	2200/-
علامہ شبلی و سید سلیمان ندوی	
مقدمہ سیرۃ النبیؐ	30/-
الفاروق	300/-
الغزالی	200/-
المامون	100/-
سیرۃ النعمان	300/-
سوانح مولانا روم	80/-
شعر العجم اول	150/-
شعر العجم دوم	130/-
شعر العجم سوم	125/-
شعر العجم چہارم	150/-
شعر العجم پنجم	120/-
الانتقاد علی تاریخ التمدن الاسلامی	350/-
(محقق ایڈیشن) تحقیق: ڈاکٹر محمد اجمل ایوب اصلاحی	
الکلام	230/-
علم الکلام	180/-

کتاب	قیمت
موازنہ انیس و دبیر	100/-
اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر	85/-
سفرنامہ روم و مصر و شام	100/-
کلیات شبلی (اردو)	180/-
کلیات شبلی (فارسی)	45/-
مقالات شبلی اول (مذہبی)	100/-
مرتبہ: سید سلیمان ندوی	
مقالات شبلی دوم (ادبی) //	70/-
مقالات شبلی سوم (تعلیمی) //	80/-
مقالات شبلی چہارم (تنقیدی) //	200/-
مقالات شبلی پنجم (سوانحی) //	150/-
مقالات شبلی ششم (تاریخی) //	90/-
مقالات شبلی ہفتم (فلسفیانہ) //	100/-
مقالات شبلی ہشتم (قومی و اخباری) //	110/-
خطبات شبلی مرتبہ: عبدالسلام ندوی	80/-
انتخابات شبلی مرتبہ: سید سلیمان ندوی	45/-
مکاتیب شبلی اول //	150/-
مکاتیب شبلی دوم //	190/-
شذرات شبلی مرتبہ: ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی	220/-

ISSN 0974 - 7346 MA'ARIF (URDU) -PRINT
NOV 2015 Vol- 196 (5)
RNI. 13667/57 **MA'ARIF** AZM/NP- 43/016
Monthly Journal of

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY
P.O.Box No: 19, Shibli Road, AZAMGARH, 276001 U.P. (INDIA)
Email: shibli_academy@rediffmail.com, info@shibliacademy.org
Website: www.shibliacademy.org Fax No: 05462 - 265080
Bank Name: Punjab National Bank - Heerapatti, Azamgarh
Account No: 4761005500000051 - IFSC No: PUNB0476100
✆ (Office Mobile) 07607046300 / 09170060782

تصانیف ومطبوعات شبلی صدی تقریبات

نمبر	کتاب		مصنف	قیمت
۱۔	سیرۃ النبیؐ جلد اول ودوم (یادگار ایڈیشن)		علامہ شبلی نعمانی	2000/-
۲۔	شبلی کی آپ بیتی		ڈاکٹر خالد ندیم	325/-
۳۔	دارالمصنّفین کے سو سال		کلیم صفات اصلاحی	350/-
۴۔	شذرات شبلی (الندوہ کے شذرات)		مرتبہ: ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی	220/-
۵۔	الانتقاد علی تاریخ التمدن الاسلامی		علامہ شبلی نعمانی تحقیق: ڈاکٹر محمد اجمل ایوب اصلاحی	350/-
۶۔	محمد شبلی لائف اینڈ کنٹری بیوشنس		ڈاکٹر جاوید علی خاں	230/-
۷۔	سیرت عائشہ	(ہندی ترجمہ)	علامہ سید سلیمان ندوی	325/-
۸۔	عرب وہند کے تعلقات	(ہندی ترجمہ)	// //	200/-
۹۔	خطبات مدراس	(ہندی ترجمہ)	// //	125/-
۱۰۔	دین رحمت	(ہندی ترجمہ)	مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی	200/-
۱۱۔	ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری، اول	(ہندی ترجمہ)	سید صباح الدین عبدالرحمن	125/-
۱۲۔	ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری، دوم	(ہندی ترجمہ)	// //	180/-
۱۳۔	ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری، سوم	(ہندی ترجمہ)	// //	225/-